وردی وعدہ اور وفائیں



ساجدہ حبیب

وہ کسی وعدہ اور وفا کی آس

شہر میں ساون کے بادل شام ہوتے ہی امڈتے چلے آئے۔ اور جب رات کا دل کش سماں ہر سو چھا گیا۔ تو گرج گرج کر اپنی بے پناہ اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے چاروں طرف برسنے لگے۔

ڈھاکہ کے ڈی سی ہاؤس کے وسیع سبزہ زار پر برستی ہوئی اس برسات نے مغربی پاکستان سے آئے ہوئے مہمانوں کی آنکھوں کو ایک خوشگوار حیرت عطا کردی۔ کہ بلاشبہ مشرقی پاکستان کی اس برستی ہوئی برسات کا رنگ بے حد خوب صورت تھا۔

اس وقت وفد کے تمام ارکان باہر برآمدے میں نشست فرما تھے اور میزبانی کے ایک دل فریب ماحول میں فرائیڈ فش کے ساتھ سلہٹ کی چائے سرو کی جارہی تھی۔ گفتگو کا رخ حسن بنگال اور کسس بازار کے ساحلوں سے شروع ہو کر ..... سحر بنگال کے کرشماتی معجزات سے ہوتا ہوا اب سیاست کی جانب آچکا تھا۔ یہ سن ساٹھ کی دہائی کا پرسکون زمانہ تھا۔ جبکہ عین عالم شباب میں وطن عزیز اک دبی دبی سی شورش کی زد میں تو "تقریباً" آچکا تھا۔ لیکن معاملات..... بہرحال قدرے ترتیب اور تناسب کے ساتھ رواں دواں تھے۔

اگرچہ راوی چین ہی چین تو لکھ رہا تھا۔ تاہم کہیں پر کوئی چنگاری پوشیدہ راکھ ضرور تھی۔ کیونکہ ذہنوں کی تبدیلی کا عمل شاید شروع ہوچکا تھا۔ لہٰذا حالات کے رخ کا کسی قدر تعین کرلینے کے بعد سماجی رسومات کے تحت خیر سگالی وفود کی آمد کے سلسلے کا خیر مقدم کیا گیا تھا اور اس وفد کی آمد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

چنانچہ اسی شام ..... پاک آرمی ڈھاکہ کے آفیسرز میس کوارٹرز میں ڈی آئی جی ڈیوٹی پر تعینات میجر حسن امام کے اس کی گزرگاہ پر چلتی ہوئی وہ لڑکی زیست کا رخ بدل گئی۔ جس کا

مکمل ناول



نام منزہ میر علی تھا اور وہ اس وفد کی سب سے کم سن رکن تھی۔

میجر حسن امام کی زیست کے پُرسکون تالاب میں وقت نے شکست کا پہلا پتھر اس وقت پھینکا۔ جب متحدہ پاکستان کی قومی ایرلائن کے طیارے نے اپنے سینے پر "پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز" کے جلی حروف فخریہ انداز میں سجائے ہوئے ڈھاکہ ایئرپورٹ کے رن وے کو چھوا اور پھر مخصوص دھیمے انداز میں اپنے سفر کا اختتام کرتے ہوئے ٹرمنل کی بلڈنگ کے عین سامنے آن رکا۔

میجر حسن امام چونکہ میزبان تھے لہٰذا اس پرواز سے آنے والے وفد کو خوش آمدید کہنے کے لیے آگے بڑھے۔ طیارے کا دروازہ کھلا اور فرسٹ کلاس سے اترنے والے وفد میں شامل منزہ میر علی ان نگاہوں کا نصیب بن گئی۔ جن نگاہوں میں وطن سے محبت' وفاداری اور قربانی کا عزم نمایاں تو تھا۔ لیکن جو احترام انسانیت اور آدمیت کا درس دیتے ہوئے احتراماً "جھک جانا بھی بخوبی جانتی تھیں۔

چنانچہ پہلی بھرپور نظر کے بعد.... یہ نگاہیں بھی احتراماً "جھک گئیں شاید.... یہ اعترافِ شکست تھا یا پھر اس جلوے کی تاب نہ تھی؟ دھڑکتے دل نے فوری فیصلہ سنایا کہ بلاشبہ کچھ لوگ طلسماتی شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں نظریں اٹھا کر دیکھتے چلے جانا کوئی آسان امر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس اعترافِ شکست کا پہلا لمحہ تو حیرت کا تھا۔

لیکن دوسرا لمحہ اپنی بے پناہ جرات اور عزم کے ساتھ سامنے آیا۔ جبکہ لاؤنج کے اندرونی دروازے سے باہر آتے ہوئے انہوں نے بالکل غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ منزہ میر علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لائیے اپنا بیگ مجھے دے دیجیے۔"

منزہ میر علی چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے ایک نظر میجر حسن امام پر ڈالی اور پھر نہایت لاپروائی سے جواباً "کہا۔

"شکریہ۔ میں اپنا بوجھ خود اٹھانا جانتی ہوں۔"

اس لمحے میجر حسن امام چھ فٹ دو انچ قد کے باوجود سکڑ کر بالشت بھر کا رہ گیا۔ اگرچہ یہ تیکھا جواب مزید کسی تیکھے جواب کا متقاضی تھا۔ لیکن دیگر اراکین وفد کی موجودگی میں خاموشی ہی بہتر تھی کہ مزید گفتگو کا سلسلہ ماحول کے علاوہ ان کی اپنی شخصیت پر بھی اثر انداز ہو سکتا تھا۔

ایئرپورٹ سے ڈھاکہ کے ڈی سی ہاؤس تک راستہ طے کرتے ہوئے اپنی اس پیشکش کو صریحاً "حماقت قرار دیتے ہوئے اس نے کئی باتیں اپنے جسم کے اندر دھڑکتے ہوئے دل کو سنا ڈالیں۔ جو ہمیشہ انسان کو عقل و شعور کے خلاف چلنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے اور انسانی دماغ کے مقابلے میں انتہائی کمزور ہونے کے باوجود بھی اپنے اور دماغ کے مابین جنگ میں بیشتر فتح حاصل کرلیتا ہے۔ اور اب اس وقت بھی جبکہ تعارف کے ابتدائی مراحل طے ہو جانے کے بعد یہ حقیقت سامنے آچکی تھی کہ تاریخ جیسے اہم مضمون میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وطن عزیز کی تاریخ لکھنے کا عزم رکھنے والی یہ خاتون اپنی فیلڈ میں ایک بہترین مقررہ ہونے کے باوجود اس وقت ایک خاموش طبع گھریلو لڑکی نظر آرہی تھی۔

بہت مختلف انداز میں چائے کا کپ ہاتھ میں لیے وہ اس وفد کے سب سے سینئر رکن رفیق صدیقی صاحب سے کہہ رہی تھی۔

"مسائل کا حل صرف مذاکرات میں ملتا ہے۔ بڑی سے بڑی شورش اور انقلاب کو تلوار کے زور پر روکنے کا عزم کرنا نادانی ہے۔ زندہ قومیں عقل کُل کا راستہ طے کرتے ہوئے مذاکرات سے مسائل حل کرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ ہمیں بھی یقیناً "کھلے دل سے مذاکرات کے وسیلے کو قبول کرلینا چاہیے۔"

اور پھر بنگال کی سرسراتی ہوئی ہوا نے حسن امام کے کان میں سرگوشی کی یہ خاتون نہ صرف یہ کہ بذات خود بے حد حسین ہے۔ بلکہ اس کے خیالات بھی بہت خوب صورت ہیں۔"

مکمل طور پر کلر بلائنڈ ہونے کے باوجود بھی.... میجر حسن امام نے جان لیا کہ فیروزی اور نیلے رنگ کے کلر کمبینیشن میں خوب صورت امتزاج کا رنگ لیے ہوئے لباس اس پر جچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ اور ملاحت کا رنگ لیے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس وفد میں شامل دیگر خواتین کی نسبت اپنے سر پر باوقار انداز میں دوپٹہ اوڑھے ہوئے منزہ میر علی واقعی بے حد خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

بنگال کی بھیگی ہوائیں ڈی سی ہاؤس کے سبزہ زار پر لگے اونچے درختوں کے اوپر سے سرسراتے ہوئے گزرنے لگیں۔ بوندوں کی آواز نے مدھم رم جھم کا انداز اپنا لیا۔

اور جب رات کا سماں ڈھاکہ شہر پر چھانے لگا۔ تو میجر حسن امام کے دل نے ایک فیصلہ کرلیا۔ منزہ میر علی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ حالانکہ یہ صریحاً "نادانی تھی۔ اور ایک طرح کا پاگل پن بھی کہ اجنبیت کی اونچی دیواریں حائل ہونے کے باوجود بھی اب یہ انوکھی سوچ سامنے آچکی تھی۔ حالانکہ جب اس کا پوسٹنگ آرڈر لاہور سے ڈھاکہ کے لیے موصول ہوا۔ تو اماں دہائیاں دیتی رہ گئیں۔ ان کے آنسو فریادی تھے کہ وہ بھی ہر مشرقی ماں کی طرح حسن امام کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو مند تھیں۔ انہوں نے اسے بہتیرا قائل کرنے کی کوشش کی۔ اپنی بھانجیوں بھتیجیوں سے لے کر جملہ رشتہ داروں تک کی لڑکیوں کی تصاویر دکھا ڈالیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور اس کی مشرقی پاکستان کے لیے روانگی کے دن قریب آگئے۔ ڈھاکہ کی برستی برسات کے اس سمے کی طرح اماں کا دل بھی چلا چلا کر رویا۔ لیکن ان کے آنسوؤں کے جواب میں اس کا بھی جواب فقط یہی تھا۔

"نہیں.... میری پیاری ماں! ابھی نہیں۔"

"تو پھر کب؟" اماں بھی روایتی ماں ہونے کے ناطے باقاعدہ بحث پر آمادہ تھیں۔

"جوں ہی وہ مجھے نظر آئے گی میں آپ کو اطلاع کردوں گا۔" اس نے مشرقی پاکستان روانگی کے لیے بوریا بستر باندھتے ہوئے جواب دیا۔ چنانچہ تین بہنوں کے اس اکلوتے بھائی کی اتنی دور روانگی کا مرحلہ اس وقت تقریباً "ایک دلخراش سانحہ بن گیا۔

جبکہ ایئرپورٹ تک پہنچتے پہنچتے اماں کے آنسو اس کے جگری دوستوں کے جلوس میں سفر طے کرتے ہوئے باقاعدہ اس قسم کے روایتی دل سوز "بین" کا رخ اختیار کر گئے۔ جن میں سروں کے باقاعدہ تال میل کے ساتھ مستقبل قریب میں تقریباً "پیش آنے والے ناگہانی حادثات اور سہتے ہوئے ناقابل برداشت دکھوں کی اطلاعات جملہ احباب کو پہنچائی جاتی ہیں۔

چنانچہ اماں کے بیان کردہ 'بین' اب اس امر کی باقاعدہ غمازی کر رہے تھے۔ جس کا تمام تر زور بیان کچھ اس طرح تھا کہ "بہت ممکن ہے کہ اے جان مادر! تمہاری واپسی تک میں اس جہان کارزار سے منہ، جانب دار البقا کوچ کر چکی ہوں گی اور تمہارے سہرے کی کھلنے والی کلیوں کی دید کی حسرت لیے ہوئے میری آنکھیں بند ہو چکی ہوں گی۔"

پھر وہ.... ان تمام بیان کردہ حقائق کی روشنی میں اپنی زندگی کا باب کچھ اس طرح بند کرنے کی دھمکی دیتے گئیں کہ گاڑی کی اگلی نشست پر تشریف فرما عباس ماموں اکلوتی بہن کی جدائی کے احساس سے تھرا اٹھے۔ اور اس درویش صفت انسان نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"بہن جی! اپنے آپ کو بددعائیں نہ دیں۔ ان شاء اللہ خیر ہوگی۔"

"جس طرح اس کے باپ نے کچھ نہ دیکھا۔ میں بھی کچھ نہ دیکھوں گی۔" انہوں نے اپنے جاری کردہ بیانات کا گویا کہ آخری نکتہ بیان فرمایا۔

اب کی بار ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی عارفہ نے قدرے غصے سے کہا۔ "جب اباجی کا انتقال ہوا تو بھائی کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ اب اتنی کم عمری میں ان کے سر پر سہرا بھلا کس طرح سجایا جاسکتا تھا؟"

اس سے قبل کہ اماں، عارفہ کو بھی کوئی کڑوا سا جواب دیتیں۔ گاڑی ایئرپورٹ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ پارکنگ کے اندر بر آمدے تک یہ انکشاف ہوا کہ موصوف کی الوداعی رسومات کی ادائیگی میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرنے کے باعث اب الوداعی مصافحہ اور معانقہ کا وقت باقی نہ بچا تھا۔ چنانچہ لاہور سے ڈھاکہ کے لیے فلائٹ تیار تھی۔ لہٰذا انہیں مناسب سلام دعا کے بغیر ہی اس ہجوم میں گم ہونا پڑا جو مسافرت کے اس آغاز پر ان کا ہم سفر تھا۔

لہٰذا اماں لاہور میں ہی سراپا انتظار رہیں۔ اور بے شمار آرزوؤں اور حسرتوں کے جلو میں عزیزم حسن امام ڈھاکہ سدھار گئے۔

جب مغربی پاکستان میں ان کی واپسی کی آس لگائے ہوئے اماں کی مایوسی آخری حدوں کو چھونے لگی تو بھاگتے شب و روز میں سخت ترین ڈیوٹی کی ٹینشن سے قطع نظر ایک دل کش ماحول میں میجر حسن امام کو گوہر مراد نصیب ہو گیا لیکن اب ایک اہم سوال سامنے تھا۔ اس گوہر مراد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی مناسب وسیلہ تلاش کرنے کا۔ لیکن ان لمحوں میں قدرت مہربان تھی۔ جب ہی تو اس وفد کے سب سے سینئر رکن رفیق صدیقی

صاحب نے دورانِ گفتگو اسے اپنے زمانے کی نہایت دیانت دار اور شریف النفس سرکاری افسر مرتضیٰ امام کے صاحبزادے کی حیثیت سے پہچان لیا اور اپنے برابر موجود منزہ میر علی سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا۔

"ان سے ملیے۔ میرے محترم سینئر افسر مرحوم مرتضیٰ امام کے صاحبزادے۔ میجر حسن امام!"

شناسائی کے اس پہلے پل پر یہ پہلا قدم تھا کہ اس کے بعد ڈی۔ سی ہاؤس سے ہوٹل روانگی کے وقت انہیں سیکیورٹی ڈیوٹی کے عین مطابق اراکین وفد کو بحفاظت اس فائیو اسٹار ہوٹل تک پہنچانے کے لیے ساتھ جانا تھا۔ جو "انٹر کانٹی نینٹل" کہلاتا تھا۔ ہوٹل کی لابی سے تھرڈ فلور تک پہنچ کر جب حسن امام نے تنہا کمرے کی جانب رواں منزہ میر علی سے کہا۔

"آیئے میں آپ کو کمرے تک چھوڑ آتا ہوں۔"

"شکریہ!" اس نے صاف کھردرے لہجے میں کہا۔ "آپ زحمت نہ کیجیے۔ میں اپنا راستہ خود طے کرنا جانتی ہوں۔" کمال کی خود اعتمادی تھی۔ کہ بتیس سال تک کی عمر طے کرنے والا میجر حسن امام اپنی دراز قامتی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عاجزی کے مارے اپنے نادان دل کی پسند پر جھک کر رہ گیا۔ اور بالکل خاموش اس سمت نگاہیں جمی رہیں۔ جس سمت جا کر اس کا وجود بند دروازے کے پیچھے روپوش ہو گیا تھا۔

باہر جھلملاتی ہوئی رات اب پرسکون تھی۔

ساون کے بادل بے تحاشا برسنے کے بعد اب خاموش تھے۔ فضا میں قدرے سکوت تھا۔ اس قدر سکون اور سناٹے میں بھی میس تک پہنچتے ہوئے اس کے دل و دماغ کے اندر ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔

طلوعِ سحر کے آثار تھے۔ جب اس نے اماں کے نام ایک طویل خط لکھ کر اپنے گزشتہ ناکردہ گناہوں کی معافی طلب کی اور اپنی نام نہاد عزت اور سلامتی کا واسطہ دیتے ہوئے عظیم الشان اطلاع بہم پہنچائی کہ اب بفضلِ تعالیٰ پیرانہ سالی کی خارزار وادی میں داخل ہونے سے پہلے ہی الحمدللہ کہ انہیں گوہر مراد نصیب ہو گیا ہے۔ لہٰذا سہرے کے لیے کلیاں چننے کا اعلا مرتبت کام شروع کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ بذات خود۔ (اس ضمن میں تمام تر معلومات اکٹھی کرنے کے بعد) بہت جلد ان کی خدمتِ اقدس میں حاضری دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یہ انتہائی اہم خط پوسٹ کرنے کے بعد جب وہ صبح دفتر تشریف لے گئے۔ تو معلوم ہوا کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر مغربی پاکستان سے آنے والا یہ وفد شیڈول کے برعکس اپنا دورہ مختصر کرتے ہوئے صبح چھ بجے کی پرواز سے واپس جا چکا ہے۔ وفد میں شامل بعض اراکین نے گزشتہ روز دی جانے والی بریفنگ میں بریگیڈیئر سراج کے بیان کردہ چند اہم نکات پر اپنے زبردست ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس امر کا فیصلہ کیا تھا۔

تو گویا۔۔۔ گوہر مراد فقط ایک جھلک دکھلا کر دل و دماغ کے علاقے میں شورش برپا کرنے کے بعد پرواز کر چکا تھا اور اب پھر کارزارِ حیات میں ہر سو ویرانی ہی ویرانی تھی۔ جس کا سلسلہ کچھ اس طرح سے طویل ہوتا چلا گیا کہ سمے کے ہر ایک پل میں ایک ہی تصویر نظروں کے سامنے رہنے کے باعث جب عزیزم میجر حسن امام کی کارکردگی کسی قدر متاثر ہونے لگی۔ اور ایک بہترین تناسب کے ساتھ چلتا ہوا سلسلۂ حیات تقریباً "الٹ پلٹ" ہونے لگا۔

تو عزیز از جان دوست میجر مصطفیٰ نے دوستوں کی محفل میں انہیں اب باقاعدہ شادی شدہ ہو جانے کا مشورہ بالکل مفت عنایت فرمایا۔ ان کا نظریہ تھا کہ اپنا انتہائی اہم عمل بروئے کار لانے کے بعد انسان بالکل صحیح معنوں میں بندے کا بچہ بن جاتا ہے۔ بیگم طنابیں کھینچ کر رکھتی ہے تو زندگی کا سرکش گھوڑا قابو میں رہتا ہے۔ اور کئی کام خود بخود سنور جاتے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے نہایت رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تو چاہے تو میں تیری خاطر یہاں کسی بھی بنگالی گھرانے میں بات چلا سکتا ہوں۔ یہاں میری بڑی واقفیت ہے یار!" انہوں نے گویا کہ اطلاع بہم پہنچائی۔

"تو فکر نہ کر۔" حسن امام نے تقریباً بےزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں اپنا انتظام خود کر لوں گا۔"

"اچھا۔" میجر مصطفیٰ نے حیرت سے کہا۔

"تو پھر بہتر ہو گا۔ اگر تو یہ انتظام ذرا جلدی کر لے۔ ورنہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے کام سے لاپروائی برتنے اور صبح سویرے سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دفتر آنے کے

جرم میں۔۔۔ اللہ نہ کرے ایک طویل پریشانی سامنے آ سکتی ہے۔"

"کبھی کوئی خیر کا کلمہ بھی منہ سے نکال لیا کرو۔" حسن امام نے غصے سے کہا۔ لیکن میجر مصطفیٰ نے برجستہ جواب دیا۔

"یہاں کے کسی بنگالی گھرانے میں تمہاری طرف سے سلسلۂ جنبانی شروع کرنے کی بات کلمۂ خیر ہی تو تھی۔ لیکن تم نے اس کی کیا قدر کی؟"

"چل چھوڑ کوئی اور بات کر۔" حسن امام نے کہا۔

"کوئی اور بات یہ ہے برادرِ عزیز!" میجر مصطفیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کہ پرسوں شام کو میلا کے مینامتی کنٹونمنٹ میں کرنل سلطان کیانی کی بیٹی کی شادی خانہ آبادی کے لیے ایک شاندار تقریب منعقد کی جا رہی ہے اور اس میں شریک حکمرانوں کی رکھوالی کے لیے ہمیں بھی مدعو کیا گیا ہے۔ لہٰذا تو فٹافٹ تیار ہو جا۔ شاید وہاں تیرا بھی کوئی چانس نکل آئے۔" میجر مصطفیٰ نے خاص انداز میں مسکرا کر اپنی بات مکمل کی۔ تو حسن امام نے سنجیدگی سے کہا۔

"تجھے نہیں معلوم کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔"

"اب اس سوچ کا بھلا کیا فائدہ؟" میجر مصطفیٰ نے سرد آہ بھری۔

"آنے والے آئے اور اپنا مشن مکمل کیے بغیر تقریباً ناراضی کے عالم میں چھ بجے کی پرواز سے لوٹ گئے۔ اب اگر تو یہاں بیٹھ کر بین بجاتا رہے گا تو تیری مرضی۔ بغیر کسی ٹرانسمشن لائن کے۔ اب تیری آواز تو مغربی پاکستان پہنچنے سے رہی۔"

"تو پھر۔۔۔ میں کیا کروں؟" حسن امام نے گویا کہ اک لاچارگی کے احساس سے کہا۔

"اس کے لیے تجھے تین اہم شخصیات کے پاؤں پکڑنے پڑیں گے۔" میجر مصطفیٰ نے کہا۔

"نمبر ون اپنے کمانڈر صاحب جن کی ذات شریف سے چھٹی کے لیے درخواست کرنی پڑے گی۔ نمبر ٹو آپ کی والدہ محترمہ۔ اور نمبر تھری رفیق صدیقی صاحب جو تجھے تیری منزل تک پہنچانے کے لیے نہایت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔"

حسن امام نے اٹھ کر کمرے سے باہر جانا چاہا تو میجر مصطفیٰ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"اس راہ خار زار پر اگر تو یاروں کا ہاتھ تھام کر چلے گا۔ جس پر تجھ سے قبل رانجھا، فرہاد اور مسٹر قیس وغیرہ چل چکے ہیں اگرچہ حاصل تو ان بدنصیبوں کو کچھ نہ ہو سکا۔ ماسوائے اس کے۔۔۔ کہ بے چارے انتہائی شدید آبلہ پائی کے باعث اناللہ ہو گئے۔ مگر تو اتنا یقین رکھ کہ ان شاء اللہ تجھے اس جہاد میں بھی سو فیصد کامیابی حاصل ہو گی۔" میجر مصطفیٰ نے حسب عادت لمبی تمہید باندھی۔

"شکریہ۔" اس قدر طویل وضاحت کے جواب میں حسن امام نے تلملا کر کہا۔

"اگر آپ کی بکواس ختم ہو گئی ہو تو براہ کرم مجھے جانے دیجیے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔" میجر مصطفیٰ نے ہنس کر کہا۔

"جا بچے چلا جا۔ میں تجھے روکوں گا نہیں۔ لیکن یاد رہے۔ اللہ پاک تیرے سپنوں کی دنیا کو شاد و آباد رکھے۔ (آمین) لیکن کل کو میلا روانگی کے لیے وقت پر تیار ہو جانا۔ ایسا نہ ہو کہ تو سوتا ہی رہ جائے اور آرزوؤں کے تمام

پرندے اسی طرح اڑ جائیں۔ جس طرح پی آئی اے کی چھ بجے والی پرواز اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکی تھی اور تو آنکھیں ملتا ہوا مجھ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ "اب کیا ہو گا؟"

زندگی کے اس انتہائی اہم موڑ پر..... اسی طرح کی لایعنی بکواس اب اس قسم کے حالات کی متقاضی تھی۔ جس میں فریقِ مخالف کو دھکے دے کر باہر نکالنا حق بنتا ہے۔ حسن امام نے بھی بالکل ایسا ہی کرنا چاہا۔

اس سے پہلے کہ اپنے اس حق کو واضح طور پر تسلیم کرتے ہوئے وہ مدِمقابل پر حملہ آور ہو جاتا۔ میجر مصطفیٰ نے صورتِ حال کو واضح طور پر بھانپتے ہوئے اچانک کہا۔

"بھئی..... وہ تمہارا ایک خط آیا ہوا ہے۔ مجھے پرسوں ہی ڈاک سے موصول ہو گیا تھا۔ تم اسٹیشن میں موجود نہ تھے۔ میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔"

اب یہ ایک ایسا معقول بیان تھا۔ جس پر بلاشبہ بنائی کرنے جیسا عمل اور وہ بھی برسرِعام۔ اس مردِ آہن کا حق بنتا تھا۔ مگر حسن امام نے تو محض چند ناپسندیدہ لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کرنے کے بعد خط اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ یہ عارفہ کی تحریر تھی۔

"بھیا! اماں کہہ رہی ہیں کہ پہیلیاں مت بجھواؤ۔ سیدھی طرح بات کرو۔ اگر ممکن ہو سکے تو فوراً" چھٹی لے کر چلے آؤ۔ تاکہ کوئی بات بن سکے۔"

لیکن..... بات کچھ اس طرح بنی کہ ڈھاکہ سے کومیلا کے ضیامتی کنٹونمنٹ تک پہنچتے ہی ایک خوشگوار حیرت لمحوں کا نصیب بن گئی۔ کرنل سلطان کیانی کی دخترِ نیک اختر کی شادی کا روح پرور ہنگامہ بپا تھا۔ ضیامتی کنٹونمنٹ کے تقریباً" وسط میں واقع ایک کھلے میدان میں اس تقریبِ سعید کا اہتمام کیا گیا تھا۔ حسن امام اور میجر مصطفیٰ کمال اپنے بنگالی کورس میٹ میجر سکین تاج کے ہمراہ ایک طرف کھڑے مقامی سیاست دان نادر محی الدین کے اس بیان پر تبصرہ کر رہے تھے۔ جس میں بیان کردہ فرمودات کے مطابق علیحدگی کی ایک بھیانک تصویر سامنے نظر آ رہی تھی۔ جبکہ میجر سکین تاج کہہ رہے تھے۔

"کوئی..... کچھ نہیں کر سکے گا۔ ہم لوگ متحد رہیں گے۔ ایسی باتیں فقط چند نادانوں کا خیال ہے اور ہماری قوم کا اس سے متفق ہونا قطعی ضروری نہیں۔"

میجر حسن امام نے یہ بات سن کر اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اس کی نظریں میجر سکین تاج کے چہرے پر جا رکیں۔

سانولی رنگت اور سیاہ آنکھوں میں وفا کی تشبیہ واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ پانچ فٹ دو انچ قد کے مالک سکین تاج کے سینے میں متحدہ پاکستان کا حامی وہ دل دھڑک رہا تھا۔ جو دوستوں اور مہمانوں کی محبت سے سرشار تھا۔ اور ہر فرقے' ذات اور برادری سے بالاتر ہوتے ہوئے صرف..... اور صرف اپنے وطن کے لیے انتہائی اعلا سوچ رکھتا تھا۔

اپنی زندگی میں دور اندیشی کا عنصر رکھنے والے زیرک میجر مصطفیٰ نے سکین تاج کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہاری سوچ اور وفا کی قدر کرتے ہیں سکین تاج! ہم..... اور تم یقیناً" ایک ہیں اور ان شاءاللہ ایک ہی رہیں گے۔ نادر محی الدین جیسے لوگ تو نفسیاتی مریض ہیں۔ ہمیں ان کی سوچ کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔"

"بے شک۔" سکین تاج نے انتہائی اعتماد کے ساتھ جواب دیا اور یقین مہر و وفا کی اس بااعتماد فضا میں حسن امام کی نظریں اس جانب اٹھ گئیں۔ جس طرف سے مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ اک حیرت اور استعجاب کے عالم میں وہ نظریں جھکانا بھول گیا۔

وہ..... بالکل وہی تو تھی۔ منزہ میر علی دلہن کی شوخ و شنگ سہیلیوں کے ہمراہ چلتی ہوئی۔ اپنے ڈھلکتے ہوئے آنچل کو بار بار سنبھالتی ہوئی ایک باوقار چال کے ساتھ وہ پنڈال کی اس سمت چل گئی جہاں قدرے اونچائی پر بنائے گئے اسٹیج پر گلوکارہ فردوسی بیگم نغمہ سرا تھی۔

پل بھر میں یہ حسین منظر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اور جب منزہ میر علی پل دو پل کے لیے نگاہوں کا نصیب بننے کے بعد اوجھل ہو گئی۔ اور ایک حسین ترین منظر سٹ چکا تو حسن امام نے میجر مصطفیٰ کو کہنی کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ کوئی بھی انہونی گزر جانے کی اطلاع دی۔ اور قدرے غصے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ دنوں چھ بجے کی پرواز سے لوٹ جانے والے مسافر تو یہیں مقیم ہیں۔

اور یہ کہ اس نے ہمیشہ کی طرح زندگی کے اس انتہائی نازک اور اہم موڑ پر بھی حسن امام کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔

میجر مصطفیٰ نے تمام حقیقت بغور سننے کے بعد مصنوعی غصے سے کہا۔

"تمام واردات مکمل ہونے کے بعد تو اب مجھے بچا بچا کہنیوں کے انداز میں کہنی مار کر خبردار کر رہا ہے۔ ذرا پہلے بتا دیا ہوتا۔ تو میں ہی ہمت کرتے ہوئے آگے بڑھ کر پوچھ

لیتا کہ محترمہ آپ اب تک واپس کیوں نہیں گئیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ تیرا وہم ہو گا۔ تجھے تو ویسے بھی اب جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی عادت ہو چکی ہے۔"

"میں اپنے ساتھ موجود احباب پر اپنی کسی بھی قسم کی کمزوری کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔" حسن امام نے کہا۔

"اوئے صدقے جاواں۔" میجر مصطفیٰ نے اپنی روایتی شوخی کے ساتھ کہا۔

"یار! اب تو سیدھی طرح مجھ سے فریاد کیوں نہیں کرتا کہ میں اس سلسلے میں تیری مدد کروں۔"

"فریاد کرنا میرا شیوہ نہیں۔" حسن امام نے جواباً" کہا۔

"تو پھر التجا کر لے۔" میجر مصطفیٰ نے برجستہ جواب دیا۔

"یہ التجا تو میں رب کریم کی ذات کے بعد اپنی والدہ محترمہ سے ہی کروں گا۔" حسن امام نے بے نیازی سے کہا۔ تو میجر مصطفیٰ کے تن بدن میں تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ اور وہ تقریباً" غصے کے عالم میں بولا۔

"تو بے شک ساری دنیا سے فریادیں کرتا رہ۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ اب تو جس صحرا کا مسافر ہو چلا ہے۔ اس صحرا میں یاروں کی مدد کے بغیر منزل کا حصول ایک ناممکن امر ہے۔"

"یار بھی کسی کام کے ہوں۔ تب بات ہے ناں۔" حسن امام نے بدستور لاپروائی سے کہا۔

"اچھا" تو اب تم مجھے چیلنج کر رہے ہو؟" میجر مصطفیٰ کا غصہ اب ناراضی میں بدل چکا تھا۔

"یہی سمجھ لو۔" حسن امام نے کہا۔

"تو..... یہ بات ہے۔"

"ہاں..... بالکل یہی بات ہے۔"

"تو..... پھر دیکھ تو کہ میں کیا کرتا ہوں۔" میجر مصطفیٰ نے چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کرے گا تو؟" حسن امام نے سوال کیا۔

"دیکھ لینا بچو!" میجر مصطفیٰ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"میں نے بھی پہلی فرصت میں مغربی پاکستان جا کر تیرا رشتہ طے نہ کروایا تو میرا نام نہیں۔ میں کل ہی چھٹی کے لیے درخواست دے رہا ہوں۔"

"بڑی مہربانی۔ بہت بہت شکریہ۔" حسن امام مسکرایا۔

"اگر میرے ساتھ ساتھ تو اپنی بھی بات پکی کروا لے تو بڑا احسان ہو گا۔"

"تو میری فکر نہ کر۔" میجر مصطفیٰ نے کہا۔

"جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے۔ تو برادرم! میری تائی اماں مرحومہ اپنی زرقا کو سلیقے کا تڑکا لگا کر میرے لیے اس جہانِ فانی میں چھوڑ گئی ہیں۔ میرے والد صاحب محترم کو تو فقط قاضی صاحب کو بلانے کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی۔"

"بہت خوب۔" حسن امام نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن تو نے اس سے قبل یہ اطلاع مجھے نہیں دی۔"

"تجھے اپنے حالات سنانے سے فرصت ملے تو میں اپنا حالِ دل سناؤں ناں۔ پہلے تو تجھے اس بھرے پرے سنسار میں کوئی خاتون پسند ہی نہیں آ رہی تھی۔ اب جو محترمہ پسند آئی ہیں وہ مل ہی نہیں رہیں۔ یہ کیا کم مسئلہ ہے۔ جو میں تجھے اپنے مسائل سے آگاہ کر کے تیری مصیبت میں اضافہ کرنے کا سوچوں۔ نہیں یار ہرگز نہیں۔ میں اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا۔"

بارات کی آمد کا شور اٹھا اور نظریں بے اختیار اس سمت اٹھ گئیں۔ جہاں سے ست رنگی دھنک کی مانند دلہن کی سہیلیوں کا ایک غول پنڈال کی داہنی جانب واقع روش پر جمع ہو گیا۔ ہاتھوں میں ہار پھول لیے ہوئے اس رنگین جھمگٹے میں چھپی ہوئی منزہ میر علی ایک مرتبہ پھر نگاہوں میں سما گئی۔ نگاہوں میں حیا کی روشنی چہرے پر وقار اور سنجیدگی۔ پورے سراپا پر چھایا ہوا خود اعتمادی کا گہرا اور گھنا سایہ۔ اٹھتی اور گرتی ہوئی پلکوں کے درمیان نظروں کا سفر اور اک چارمنگ سی پرسنالٹی کے ساتھ قدرے محتاط انداز یہ تمام عناصر مل کر میجر حسن امام کے دل کی دنیا میں ہلچل مچا گئے۔

دل نے تو چاہا کہ آگے بڑھ کر حیات کے اس دلکش احساس کو لفظوں کا روپ دے کر سب کچھ کہہ دیا جائے۔ لیکن دماغ نے اجازت نہ دی اور قدم وہیں رک گئے کہ قدرت اب ان لمحوں میں مہربان تھی۔ میجر حسن امام اس سمت دیکھتا رہ گیا۔ جس طرف سے منزہ میر علی بھابھی (مسز میجر سکین تاج) کے ہمراہ ان کی طرف آ رہی تھی۔

ان سے محض چند قدم کے فاصلے پر رک کر بھابھی نے میجر سکین تاج کو بنگالی زبان میں پکارا۔ وہ متوجہ ہوئے تو اس نے اپنے ہمراہ موجود منزہ میر علی کا تعارف کچھ اس طرح کروایا۔

"یہ کرنل سلطان کیانی کی بھانجی ہیں اور اس تقریب میں شرکت کے لیے بطورِ خاص مغربی پاکستان سے آئی ہیں۔"

حسن امام اور مصطفیٰ کے قریب موجود کیپٹن شاہ پال نے میجر مصطفیٰ کے حکم پر اس بنگالی فقرے کا اردو ترجمہ کر کے ان کے گوش گزار کیا۔ کیپٹن شاہ پال بنگالی زبان جانتا تھا۔ اور ان دنوں ہیڈ کوارٹر میں ترجمان کے طور پر فرائض سر انجام دے رہا تھا۔

میجر تمکین تاج دونوں خواتین کے ساتھ اس طرف آئے اور مغربی پاکستان سے آنے والی اس معزز مہمانوں کا تعارف کروانے کے لیے فقط دو لفظ بول پائے تھے کہ حسن امام نے بتایا۔

"میں ان سے شرف ملاقات حاصل کر چکا ہوں۔ ڈھاکہ کے ڈی سی ہاؤس میں مجھے اس وفد کے لیے شرف میزبانی حاصل ہوا۔ جس وفد میں محترمہ شامل تھیں۔"

لیکن میجر مصطفیٰ حسب عادت بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہمیں تو یہ قطعی امید نہیں تھی کہ آپ سے یہاں۔ اس طرح اچانک بالکل غیر متوقع طور پر ملاقات ہو جائے گی۔"

"میں ثناء کی شادی کے لیے رک گئی تھی۔" ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی مترنم آواز اک دلکش لہجے کے ساتھ میجر حسن امام کے دل میں اتر گئی۔

"سلطان ماموں کا بے حد اصرار تھا۔"

"آپ نے یقیناً بہت اچھا کیا۔" میجر مصطفیٰ نے کہا۔ "یقین جانیے۔ آپ کا یہ عمل ہمارے حق میں سو فیصد بہتر رہا۔"

"جی۔" منزہ میر علی نے حیرت سے پوچھا۔ "میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"کچھ باتیں سمجھ سے بالاتر ہی رہیں تو بہت بہتر ہوتا ہے۔"

منزہ میر علی نے چند لمحوں تک اس بات پر غور کر کے خاموشی اختیار کر لی اور پھر قدرے حیرت کے ساتھ مسز تمکین تاج کی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

"ہم نے تو سنا تھا کہ فوجی فلسفہ نہیں بگھارتے۔ لیکن آپ تو...!" وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ چونکہ میجر مصطفیٰ کہہ رہے تھے۔

"آپ نے بالکل صحیح سنا۔ فوجی جوان اپنے اصولوں کا پکا۔ صاف اور سچی بات کہنے کا عادی ہوتا ہے۔ اسے فوری فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ہاں یا پھر ناں۔ اگر وہ فلسفہ بگھارنے بیٹھ جائے تو دشمن کے مدمقابل ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ چاہے وہ دشمن جیجم کے روپ میں ہی کیوں نہ ہو۔"

احباب محفل نے تو اس زبردست فلسفے پر انہیں مسکرا کر داد دی۔ جبکہ حسن امام کے خیال کے مطابق اب برادرم میجر مصطفیٰ کمال اخلاقیات کی حدود کو نظر انداز کرتے ہوئے لایعنی اور لاحاصل گفتگو فرمانے کے موڈ میں تھے۔ لہٰذا اس کے ذرا سے ٹوکنے پر وہ تقریباً "غصے سے بولے۔

"تمہاری بہتری کے لیے ہی تو راستہ ہموار کر رہا ہوں۔ ورنہ ذاتی طور پر اس تمام ڈرامے میں میرا کتنا فائدہ ہے۔ اس سے تو تم بخوبی واقف ہو۔"

حسن امام اپنے اس انتہائی مخلص دوست کا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش میں تھے کہ بھرا بھابھی منزہ کو اپنے ساتھ لے کر بارات کے استقبال کے لیے آگے بڑھیں۔ میجر تمکین تاج اب مؤدب کھڑے تھے۔

چونکہ ان کے سینئر بریگیڈیئر سراج کی آمد ہو چکی تھی اور وہ بارات کے استقبال سے فارغ ہونے کے بعد کرنل سلطان کیانی سے پوچھ رہے تھے۔

"آپ نے بیٹی کی شادی کی تقریب مغربی پاکستان میں منعقد کرنے کی بجائے یہاں..... اتنی دور اس تقریب کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"یہ خطہ بھی ہمارا اپنا وطن ہے سر!" انہوں نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"میری فیملی نہیں جیجم ہے۔ میرے دوست احباب عزیز اور رشتے دار مشرقی پاکستان دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا۔"

بریگیڈیئر سراج شاید کوئی جواب نہ دے سکے اور انہوں نے باقی سب احباب کو نظر انداز کرتے ہوئے میجر تمکین تاج سے بنگالی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ ان کی گفتگو سن کر کیپٹن شاہ پال نے میجر مصطفیٰ سے کہا۔

"میں اپنے چند سینئرز کی ایسی سوچ سے بے حد پریشان ہوں۔"

"تمہاری اپنی سوچ بہت اچھی ہے برخوردار اور تمہارا جذبہ قابل قدر ہے۔ لیکن پھر بھی میرا برادرانہ مشورہ یہ ہے کہ اگر تم مسٹر قمر الدین قاضی کی فیملی سے تعلقات نہ بڑھاؤ تو بہتر رہے گا۔"

کیپٹن شاہ پال کوئی جواب نہ دے سکا۔

اب یہ حقیقت تو واضح تھی کہ اگر مغربی پاکستان سے آئی ہوئی منزہ میر علی میجر حسن امام کی ذات کا نصیب بن

چکی تھی تو بنگالی ڈاکٹر سنبل عرف ثریاء اپنے حسین بنگالی سراپے اور زلف بنگال کے جادوئی حسن سمیت کیپٹن شاہ پال کی آنکھوں کو بھلی لگتی تھی اور وہ اکثر ہی ایم ایچ ڈھاکہ سے متصل اس کے والد قمر الدین قاضی کے بنگلے پر اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ جہاں ڈاکٹر ثریاء کی بہن کومل مسکرا کر اس کا استقبال کرتی۔

قاضی صاحب خیر و عافیت دریافت کرتے۔ ان کی بیگم جہاں آرا قاضی اپنے خانساماں کو کیپٹن شاہ پال کی پسندیدہ ڈش مچھلی کا شوربہ اور چاول تیار کرنے کی ہدایت کرتیں۔ کومل کو ستار بجانے کا شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اکثر شاہ پال کی فرمائش پر ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں گایا ہوا فیض احمد فیض کا کلام "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" ستار اور بنگال کی سرسراتی ہوئی ہوائیں کیپٹن شاہ پال کے دل کی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے ڈاکٹر ثریاء سے سرگوشی کرتیں۔

"میں تمہیں..... بہت چاہتا ہوں۔ بے حد بے حساب! ڈاکٹر ثریاء تم اس دل کی مالک ہو۔ بلاشبہ اور تم ہی تو زندگی ہو۔" اور ڈاکٹر ثریاء کی نگاہیں جھک جاتیں۔

زندگی کے اس رخ پر..... وقت کے اس انداز پر کسی کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ حتیٰ کہ اس کے ننھیال والوں کو بھی نہیں۔ حالانکہ ان کی سوچ کے مطابق تقسیم ہند کا یہ اہم نقطہ قطعی غیر فطری تھا کہ ایک ہی وطن کے درمیان ہزار بارہ سو میل کی دوری ہو اور دونوں خطے پاکستان کہلائیں۔ مغربی پاکستان سے آنے والے وفد کا ناراضی کے عالم میں شیڈول کے برخلاف ہر قسم کے پروٹوکول کو نظر انداز کرتے ہوئے واپسی کے سفر کا قصد کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا کہ انہیں بریگیڈیئر سراج کی طرف سے گفتگو اور پراسرار لہجہ قطعی طور پر پسند نہیں آیا تھا۔ وہ تو محبتوں کے امین بن کر وفاؤں کا درس دینے آئے تھے۔ مگر قدرے مایوسی کے عالم میں لوٹ گئے کہ شاید اب اس دیس کی ہوائیں آہستہ آہستہ اپنا رخ بدل رہی تھیں۔

لیکن..... عجب تضاد تھا کہ جناب قمر الدین قاضی صاحب کو اس امر پر قطعی کوئی اعتراض نہیں تھا کہ عزیزم کیپٹن شاہ پال کے روابط اس گھرانے سے کیوں قائم ہیں؟ البتہ ڈاکٹر ثریاء کے اکلوتے بھائی ممتاز قاضی عرف منٹی کو اس پر بے حد اعتراض تھا اور وہ اکثر اس معاملے پر بڑی بہن سے بدتمیزی کر جایا کرتا تھا۔ لیکن مسز قاضی بڑی خوش اسلوبی سے معاملہ سنبھال لیتیں۔

واہ..... کیسا دلکش دور تھا اور کتنے وضع دار لوگ تھے نگاہوں میں وفائیں۔ احساسات میں قدر دانی دلوں میں خلوص اور پیکر خاکی میں وطن سے محبت اور وفاداری۔ دانے گندم کھانے والے اس زمانے کے یہ ابن آدم کہ جن کی سوچ وطن سے شروع ہو کر وطن پر ختم ہوتی تھی۔ وہ ایک اکائی ایک وحدت اور ایک یقین کی سیاست پر ایمان رکھتے تھے۔ وفاؤں کی اس منزل پر یقین کے تعمیر کردہ یہ پل کتنے مضبوط تھے؟

اس کا عملی نمونہ آج کی یہ تقریب تھی کہ جس میں کرنل سلطان کیانی کی بیٹی کا نکاح بنگالی گھرانے سے تعلق رکھنے والے نوید باری کے ساتھ طے پایا تھا۔ یہ ایک وطن اور دو مختلف تہذیبوں کا سنگم تھا اور بھلا یہ سلسلہ کس طرح جڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈھاکہ کی بھیگی برسات کی ایک رات تھی۔ جبکہ چھما چھم برستی ہوئی بارش میں مشہور بنگالی سیاست دان نادر محی الدین کی دختر نیک اختر کی منگنی کی رسم اس فائیو سٹار ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی۔ جسے اس زمانے میں انٹر کانٹی نینٹل کہا جاتا تھا۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے ثناء سلطان اپنے والدین کے ہمراہ پورچ میں گاڑی سے اتری اور اندرونی سمت بڑھتے ہوئے جب وہ داہنی جانب مڑی تو تقدیر نے بھی اسی لمحے ایک خوشگوار موڑ لیا اور سیدھی سادی بھولی بھالی ثناء سلطان ڈھاکہ میڈیکل کالج کی پرنسپل مسز نزہت باری اور ان کے فرزند ارجمند نوید باری کی ان نظروں کے سامنے آگئی۔ جن نظروں میں آج تک کوئی بھی لڑکی پسندیدگی کی سند حاصل نہ کر سکی تھی۔

ماں بیٹے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نگاہوں نے بیک وقت گوہر مراد حاصل ہو جانے کا پیام دیا۔ ان کے لبوں پر ایک ہی جیسی مسکان ابھری۔ وقت شاید مہربان تھا کہ اس شب ثناء سلطان کی تقدیر کا فیصلہ ہو گیا۔ وہ بے خبر رہی اور مسز نزہت باری کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ بغیر کسی رسمی تعارف کے فقط نجمہ محی الدین کی کلاس فیلو اور گہری سہیلی ہونے کے ناطے اس تقریب کے آخر میں چائے سرو کرتے ہوئے جب ثناء سلطان نے مسز نزہت باری سے پوچھا۔

"آنٹی کیا آپ چائے پینا پسند کریں گی؟" توڈھاکہ کی سول سوسائٹی میں اعلا ترین اقدار کی حامل مسز زہت باری چونک گئیں۔ تابعداری کا کیا انداز تھا اور کس قدر دلکش لہجہ۔ آواز کے زیر و بم نے مسز زہت باری کا دل موہ لیا۔ انہوں نے پیالی تھامے ہوئے سفید حنائی ہاتھ کو دیکھا اور نظریں اوپر اٹھاتے ہی شاہ سلطان کی آنکھیں اپنی لمبی سیاہ پلکوں سمیت دل میں گھر کر گئیں۔ انہوں نے مسکرا کر شکریہ کہتے ہوئے چائے کا کپ تھام لیا۔

وہ..... جو اپنی ذات میں اس وقت کی اعلا تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے کئی عدد اعزازی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد ایک کلیدی عہدے پر فائز تھیں۔ ڈھاکہ میڈیکل کالج کی پرنسپل ہونے کے ناطے وہ شہرت کے آسمان پر پرواز کر رہی تھیں اور جن کے مزاج کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے علاوہ کسی اور کو خاطر میں ہی نہ لاتی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ..... جنہیں اپنے اکلوتے بیٹے نوید باری کے لیے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آرہی تھی..... ڈھاکہ کی برستی ہوئی بارش کی اس شب شاہ سلطان کے سراپے اور دل کش لب و لہجے سے گویا کہ ہار گئی تھیں۔

اس کے بعد صرف ایک ہی دن گزرا تھا کہ مسز زہت باری نادر محی الدین کے ہمراہ اونچی نیچی بنی ہوئی ٹیکریوں پر واقع میامتی کنٹونمنٹ کو میلا پہنچ گئیں اور کسی لگی لپٹی کے بغیر صاف لفظوں میں اپنا مدعا کرنل سلطان کیانی کے گوش گزار کر دیا۔

مغربی پاکستان کے ضلع جہلم سے تعلق رکھنے والے کرنل سلطان کیانی اور ان کی اہلیہ بیگم نور سلطان ان کے اس بے باک طرز عمل اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مسز زہت باری کا انداز ایسا تھا کہ گویا وہ شاہ سلطان کا رشتہ طلب کرنے نہیں بلکہ اپنی زندگی کا کوئی اہم حق مانگنے کے لیے تشریف لائی ہوں۔

"بات یہ ہے بھائی صاحب!" انہوں نے سیدھے سادے دیہاتی مزاج رکھنے والے کرنل سلطان کیانی کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں آپ کی بیٹی بہت اچھی لگی ہے اور ہم اسے اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتے ہیں۔ ہم آپ سے درخواست تو ضرور کریں گے۔ لیکن التجا ہرگز نہیں۔ اگر آپ شرف قبولیت بخشیں گے تو زہے نصیب! بصورت دیگر ہم اپنی آرزوؤں کی پامالی پر صبر کر لیں گے۔ لیکن.....!"

وہ ذرا دیر کے لیے رک کر نہایت معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

"ہم سمجھیں گے کہ ہمیشہ کی طرح زندگی کے اس موڑ پر بھی مغربی پاکستان نے ہمارے حقوق غصب کر لیے۔"

ان کی اس طویل تمہید کے ان آخری فقروں نے خاموش و بردبار سنجیدہ بیٹھے ہوئے کرنل سلطان کیانی کے اندر غم و غصے کا ایک جہان آباد کر دیا۔ ان کا دل چاہا کہ وہ ان معزز مہمانوں کو فوری طور پر میامتی کنٹونمنٹ سے باہر نکل جانے کا حکم صادر فرمائیں۔ لیکن فوج کی روایتی تربیت میں صبر و ضبط پہلا عنصر گنا جاتا ہے۔ انہوں نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا..... آپ ایک باوقار بنگالی بہن ہونے کے ناطے مجھے یہ بتانا پسند فرمائیں گی کہ آپ ہم سے رشتہ جوڑنے کے لیے تشریف لائی ہیں یا پھر قومی زندگی کے حوالے سے یہ جتانے کہ خدانخواستہ یہ خطہ وطن صرف ہماری وجہ سے کسی قسم کی محرومیوں کا شکار ہے؟"

مسز زہت باری کو اپنی حاکمانہ فطرت کے باعث شاید اس جواب کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ان سے قبل انتہائی زیرک نادر محی الدین بول پڑے۔

"یہی تو وقت ہے محترم کرنل صاحب! کہ ہم اپنی قوم پر واضح کر دیں کہ ہم اختلافی سوچ رکھنے کے باوجود ایک ہو سکتے ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے۔"

کرنل سلطان کیانی نے نادر محی الدین کی طرف دیکھا۔ بنگال کی سیاست پر کسی کانٹے دار جھاڑی کی طرح اگنے والا یہ سیاست دان اپنے بھانجے نوید باری کی وکالت کرتے ہوئے اپنی بہن کے انداز فکر کو نظر انداز کر کے سوچ کے اس زاویے کی ترجمانی کر رہا تھا جس سوچ نے صرف اس کی ہی نہیں بلکہ مزید کئی رہنماؤں کے ذہنوں میں بھی بسیرا کر لیا تھا۔

اور یہ سوچ تھی۔ تعصب پر مبنی اس رویے کی جس نے بنگالی قوم کو یہ باور کرانے میں شاید کوئی کسر نہ چھوڑی تھی کہ ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ سنہری ریشے کی سرزمین کے یہ باسی اب دبے دبے لفظوں کی بجائے سرعام کہنے لگے تھے کہ "ہمارا پٹ سن بیچ کر اسلام آباد بسایا جا رہا ہے۔"

"برادر عزیز!" کرنل سلطان کیانی نے نادر محی الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سوچ ہی تو وہ انداز فکر ہے۔ جو

قوموں کی تخلیق کرتی ہے۔ آخر وہ کیسی شب فکر تھی۔ جس نے علامہ اقبال کے ایک خواب کو طلوع سحر کی نوید دی۔ علامہ اقبال کی سوچ سے لے کر حضرت قائداعظم کے عمل تک کا سفر کتنا پرآشوب گزرا اور آج اس پرآشوب سفر کے بعد اس منزل پر پہنچ کر ہم ایک ایسی سوچ میں گم ہیں کہ جس کے بعد رسوائی قوموں کا مقدر بن جایا کرتی ہے۔ میری معزز بہن کی تشریف آوری کا شکریہ۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ مجھے آپ کا طرز عمل پسند نہیں آیا۔"

اپنے اصولوں کے پکے اس فوجی افسر کے اس صاف جواب پر مسز زہت باری چکرا کر رہ گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی حاکمانہ فطرت کی بنا پر اس گھرانے کو پہلے مرحلے پر ہی زیر کر لیں گی اور وطن کی وفا کے جذبے سے سرشار کرنل سلطان کیانی ان کی پہلی آواز پر ہی لبیک کہتے ہوئے عزیزی شاہ سلطان کو ان کی طلب پر ان کے حوالے کرنے میں قطعی تامل نہیں کریں گے۔ لیکن..... بات تو بنی نہیں بلکہ بگڑ گئی۔

اور بات کا رخ بدلتے دیکھ کر ان کی حاکمانہ فطرت کا غرور بھی ہوا میں اڑ گیا۔ اکلوتا نوید باری ان کی سب سے بڑی کمزوری تھا اور وہ کسی بھی قیمت پر اسے مایوس کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ کہنے کو تو وہ اپنے روایتی غرور زدہ حاکمانہ لہجے میں بہت کچھ کہہ گئیں۔ لیکن اب بات بگڑتے ہوئے دیکھ کر التجا کا تاثر ان کے لہجے میں سما گیا۔ اور وہ قدرے مدھم آواز میں گویا ہوئیں۔

"میں..... اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں بھائی صاحب! دراصل مجھے آج تک کبھی کچھ بھی مانگنے کا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ وقت نے خود بخود ہر خواہش پر ہر نعمت مجھے نصیب کر دی۔ اگر آپ کو میرے رویے یا پھر لفظوں سے کوئی دکھ پہنچا ہو تو ازراہ کرم نظر انداز کر دیجیے۔"

بڑی عجیب متضاد قسم کی شخصیت تھی ان کی۔ کرنل سلطان کیانی نے ان کی طرف دیکھا۔ اپنی انا کے جال میں قید مسز زہت باری اب چہرے پر شرمندگی کا تاثر لیے ہوئے معاشرے میں اپنے لیے مختص کردہ اعلا عہدے کی نسبت اب صرف ایک ماں نظر آرہی تھیں ایک ایسی ماں جسے صرف اپنے بیٹے کی خوشی عزیز تھی۔ اس ماں اور چند لمحے پہلے تک کی تنی ہوئی گردن والی میڈیکل کالج کی پرنسپل مسز زہت باری کی شخصیت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کرنل سلطان کیانی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں بہن! ہمارے ہاں رشتے اس طرح طے نہیں کیے جاتے۔ ہم وضع دار لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں کی روایتیں اک الگ سمت رکھتی ہیں۔"

صاف لفظوں میں یہ فیصلہ سن کر مسز زہت باری چکرا گئیں۔ نوید باری نے تو گھر سے چلتے وقت انہیں کہہ دیا تھا۔ "اماں خالی ہاتھ واپس نہ آنا۔" اولاد کے یہ لفظ گویا کہ پتھر پر لکیر تھے کہ مسز زہت باری سراپا التجا بن گئیں۔ اور ان کی رندھی ہوئی آواز نے بیگم نور سلطان کے دل پر رقت طاری کر دی۔

"میں آپ کے پاؤں پکڑ کر اپنی زندگی کے لیے یہ سوغات طلب کروں گی۔ بڑی مہربانی ہوگی بھائی صاحب! خدارا مجھے مایوس نہ کیجیے۔"

میامتی کنٹونمنٹ کے اس بنگلے میں زرد دوپہر اپنی تمام تر حسرتوں کے ساتھ اتر آئی۔ جبکہ اپنے ناروا رویے کے باعث نادم مسز زہت باری آنسوؤں کے ساتھ اپنی داستان حیات گوش گزار کرتے ہوئے اب کرنل سلطان کیانی اور ان کے اہل خانہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے جتن کر رہی تھیں۔

"میں نے زندگی میں اک بہت بڑی محرومی کا سامنا کیا۔ میرے شوہر ذکاالدین باری نے مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دیا۔ جب میں اپنے کیریئر کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ نوید باری کو مجھ سے چھین لیا گیا۔ اس کی واپسی کے حصول کے لیے میں نے ایک طویل عدالتی جنگ لڑی۔ یہ بچہ میری تمام تر آرزوؤں کا مرکز ہے۔ آپ کی بیٹی ہمیں پہلی ہی نظر میں بھا گئی ہے۔ بھائی صاحب! مہربانی فرمائیے!"

انہوں نے اپنی داستان حیات میں درد کا عنصر لانے کے لیے آنسوؤں کا سہارا لیا اور ان کا یہ کمزور ہتھیار مؤثر ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ زرد دوپہر خزاں کا ثمر ثابت ہوتی کرنل سلطان کیانی نے کہا۔

"ہم سوچیں گے۔"

"بہت شکریہ۔" نادر محی الدین بالکل غیر متوقع طور پر یہ بات سن کر گویا کھل اٹھے۔

"آپ کا یہ عمل نفرت کے اس دور میں یقیناً ہمارے لیے محبت کا باعث بنے گا۔" ان کی اس بات پر کرنل سلطان کیانی نے ایک دم گویا کہ خواب کی سی کیفیت سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

"آپ..... کس نفرت کی بات کر رہے ہیں؟"

اپنی الگ پہچان بنانے کی بنیاد رکھنے والے اپنی سیاسی پارٹی جیسے بنگال کے بانی و سرپرست نادر محی الدین کے دل سے نکل کر زبان پر آجانے والے اس سچ نے ماحول کو مزید کشیدہ کردیا۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر بول تو گئے لیکن اب ان کے لیے بات کو کوئی الگ رنگ دینا ضروری ہوگیا۔ تاکہ وہ کرنل سلطان کیانی اور ان کے اہل خانہ کو مطمئن کرسکیں۔ اچانک جیسے نادر محی الدین کے اندر کا زیرک سیاست دان باہر آگیا اور انہوں نے اپنی بات کچھ اس طرح شروع کی۔

"یہ محض چند شرپسند ذہنوں کی سوچ ہے کرنل صاحب! اور آپ کی فوج اور ارباب اختیار سب ہی اس سوچ سے بخوبی آگاہ ہیں۔ آیئے علیحدگی کی اس سوچ کے اس نفرت زدہ دور میں ہم اور آپ یہ رشتہ قائم کرکے یہ ثابت کردیں کہ ہم ایک ہیں اور یقیناً "ایک ہی رہیں گے۔ ہمیں اپنی محبت یکانگت اور رواداری کی کوئی عملی مثال بھی تو دنیا کے سامنے لانی چاہیے ناں؟"

شطرنج کے مہرے کی یہ چال بہت کامیاب رہی۔ انسانی دل کے فقط ایک گوشے میں خدشات کا خانہ آباد ہوتا ہے۔ باقی دل تو سراپا خلوص و مہر و وفا ہوتا ہے۔

نادر محی الدین کے ان لفظوں نے گویا کھیل کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔ کرنل سلطان کیانی اگرچہ بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا چاہتے تھے۔ تاہم اس حقیقت نے ان کا لہجہ مدھم اور آواز ذرا دھیمی کردی کہ وہ اپنے قول اور عمل میں تضاد ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہمیشہ سے ایک وحدت کے حامی تھے اور قائداعظم کے پاکستان کو ایک اکائی کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ آج قدرت انہیں یہ موقع عنایت فرما رہی تھی کہ وہ اپنے عمل سے اپنے قول کو سچ ثابت کردیں۔ وہ ہمیشہ دوستوں کی محفل میں کہا کرتے تھے۔ "ہم تفریق پیدا کرنے والوں کو کبھی کسی صورت میں بھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

قدرت نادر محی الدین پر اس وقت بے حد مہربان تھی کہ ان کی طرف سے چلائے گئے اس مہرے کی یہ چال بے حد کامیاب ثابت ہوئی اور انہوں نے مسز نزہت باری کے رویے کو قطعی طور پر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم سوچیں گے۔"

مسز نزہت باری نے اطمینان کا اک گہرا سانس لیا۔

کومیلا کے مینامتی کنٹونمنٹ میں چھا جانے والی زرد دوپہر سکون بخش شام میں ڈھل گئی۔ آس اور امید کی ایک دنیا اپنے اندر بسائے ہوئے وہ لاتوں، بہن بھائی کرنل کیانی کے گھر کے اندر سوالات، خدشات اور وسوسوں کی اک دنیا چھوڑ کر ڈھاکہ کی طرف روانہ ہوگئے یہ سفر جاری تھا کہ مسز نزہت باری نے اچانک نادر محی الدین سے سوال کیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے بھائی صاحب! کیا ہمیں کامیابی حاصل ہوگی؟"

"سو فیصدی۔" نادر محی الدین نے اپنی چالاک فطرت کے زیر اثر تیز لہجے میں کہا۔

"میری بہن تم نہیں جانتیں ان مغربی پاکستانیوں کو، دعوا تو بہت کرتے ہیں۔ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو بالکل صفر ہوجاتے ہیں۔ یہ صرف لڑکی والوں کے روایتی نخرے ہیں۔ ورنہ کون باپ نہیں چاہے گا کہ نوید باری جیسا اعلا تعلیم یافتہ اور لائق لڑکا ان کا داماد بنے۔ یہ صرف ان فوجیوں کی نام نہاد آن ہے اور کچھ نہیں۔"

نادر محی الدین نے تو کھلے لفظوں میں اپنی اس رائے کا اظہار کردیا۔ جس میں نفرت اور تفریق کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں لیکن نزہت باری کے باوجود کے اندر چھپا ہوا ایک ماں کا دل سوچتا رہا۔ "اگر صاف انکار کردیا گیا تو پھر کیا ہوگا؟"

رات گئے ڈھاکہ واپسی پر نوید باری کا دل اپنے سوال کا کوئی مناسب جواب نہ پاکر بے حد آزردہ ہوگیا۔

مہمان جب کومیلا کے مینامتی کنٹونمنٹ سے رخصت ہوئے تو سادگی کی پیکر بیگم نور سلطان نے اپنے خدائے مجازی سے بے حد ادب کے ساتھ عرض کیا۔

"کرنل صاحب! وطن سے وفا اپنی جگہ لیکن خدارا اپنی وردی، اپنے وطن اور اپنی وفاؤں پر اپنی اولاد کو قربان نہ کردیجیے گا۔"

وہ مردانہ حاکمیت کا دور تھا۔ خاتون خانہ کی نسبت صاحب خانہ کا فیصلہ آخری اور حتمی ٹھہرتا تھا۔ کرنل صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔ ایک سیدھی سادی دیہاتی عورت کے اندر ایک ماں کا دل فریادی تھا۔ جو جانتی تھی کہ اس کے خدائے مجازی کا ہر فیصلہ اٹل ہوتا ہے اور ان کے کسی بھی فیصلے سے روگردانی کرنا ممکن ہی نہیں۔ وہ گہری سوچ کے بعد گویا ہوئے۔

"تقدیر کی لوح انسانی ہاتھوں میں نہیں ہوتی۔ نصیب آسمانوں پر جڑتے ہیں اور لوح تقدیر پر لکھا گیا مٹانا ہماری دسترس اور اختیار سے باہر ہے۔ ہم سوچ کر کوئی فیصلہ کریں گے۔ اگر میری بیٹی کے نصیب اس مٹی سے جڑے ہیں۔ تو میں اسے قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرلوں گا۔"

کومیلا کے مینامتی کنٹونمنٹ پر چھائی ہوئی بہت گہری شاموں، زرد دوپہروں اور شبنمی صبحوں کے درمیان سوچ کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ہر شام ڈھاکہ سے آنے والی مسز نزہت باری کی ٹیلی فون کال ایک اصرار بن گئی۔ احباب سے مشورے جاری رہے۔

مغربی پاکستان سے کرنل سلطان کیانی کے بڑے بھائی ڈاکٹر عرفان کیانی نے اس ضمن میں اپنے تحریر کردہ جوابی خط میں لکھا۔

"برادر عزیز!"

"ڈاکٹر ذکاالدین باری میاں زمین دارہ کالج گجرات اور بعد ازاں نشتر میڈیکل کالج ملتان میں میرے ہم جماعت رہے ہیں۔ وہ ایک نہایت شریف النفس انسان اور سلجھے ہوئے طالب علم کے طور پر جانے جاتے تھے۔ لہٰذا ان کی اولاد سے بھی ہمیں اسی قدر شریف النفسی کی توقع رکھنی چاہیے۔ ان کے والد صاحب گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالاباغ ملک امیر محمد خان کے سیکریٹری رہ چکے ہیں اور ایک اعلاترین بیوروکریٹ کے طور پر ان کی شہرت آج تک قائم ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ شادی ان شاء اللہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک مضبوط رشتے کا سبب بنے گی۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ باقی یہ کہ آپ والدین ہیں۔ آخری فیصلہ تو یقیناً آپ ہی کا ہوگا۔

ہم سب آپ کی خیریت کے طالب ہیں۔"

والسلام

خیر اندیش، عرفان کیانی۔

چند مالیت پیسے سے خریدے گئے زرد لفافے میں ملبوس لاکھوں سے بڑھ کر قیمتی یہ لفظ بھی کرنل کیانی کی مضطرب اور پریشان سوچوں کو کوئی مناسب سنگ میل عطا نہ کرسکے۔ ایسا سنگ میل جس پر زندگی کے راستوں پر چلتے چلتے تھکن کے بہت گہرے احساس کے ساتھ ذرا کی کر، دم بھر کے لیے ٹھہر کر کسی بھی سمت کا تعین کرنے کا کوئی بھی فیصلہ کیا جاسکتا۔

دوسری طرف مسز نزہت باری کا حد سے بڑھتا ہوا اصرار اب ان کی ضدی طبیعت اور ہٹ دھرمی کا احساس واضح کررہا تھا۔ ہر ہفتے ان کی کنٹونمنٹ میں آمد ایک سوالیہ نشان بن رہی تھی کہ آیا یہ سلسلہ خوش اسلوبی سے طے ہوجائے گا۔ یا پھر یہ ضد کسی عداوت کا پیش خیمہ بن جائے گی؟

دوست احباب کے مشوروں کے مطابق اس رشتے میں قطعی کوئی قباحت نہیں تھی۔ وہ احباب جو مسز نزہت باری کی فطرت سے آگاہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب بہو بن کر کوئی بھی من پسند لڑکی ان کی زندگی میں شامل ہوجائے گی۔ تو یقیناً ہی نہیں بلکہ یقیناً وہ بدل جائیں گی۔ انہیں اپنے گھر کا سکھ چین یقیناً بہت عزیز ہوگا۔

اور جب۔۔۔ مسز نزہت باری مینامتی کنٹونمنٹ کومیلا کے کئی چکر لگانے کے باوجود بھی گوہر مراد حاصل نہ کرسکیں۔ تو انہوں نے بعد اصرار کرنل کیانی کی فیملی کے ساتھ مزید چند احباب کو ڈھاکہ میں اپنے گھر پر چائے کے لیے مدعو کیا۔ جب وہ بہ نفس نفیس دعوت دے چکیں۔ تو انہوں نے سوال کیا۔

"بھائی صاحب! کیا آپ خود تشریف لائیں گے یا پھر میں خود آپ کو لینے آجاؤں؟"

"آپ زحمت نہ کریں۔" کرنل کیانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "ان شاء اللہ ہم آئیں گے۔"

وہ نہایت سرشاری کے عالم میں متوقع فتح مندی کے بے کراں احساس کے ساتھ رخصت ہوگئیں۔

اگلی اتوار کی دوپہر کرنل کیانی "باری ہاؤس" پہنچے تو مسز نزہت باری ہمراہ نوید باری و دیگر احباب کے بے تابی سے ان کی آمد کی منتظر تھیں۔ ان کا بے حد پرتپاک استقبال کیا گیا جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ تو بالکل سامنے گیلری میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا قد آدم پورٹریٹ آویزاں تھا۔ کرنل کیانی کی نظر اس تخلیق کار کی تصویر پر پڑی۔ وہ رکے اور عظمت و رفعت کے شاہکار سنہری فریم میں جڑے ہوئے اس عظیم الشان پورٹریٹ کو سیلوٹ کی صورت میں خراج تحسین پیش کرنے کے بعد احتراماً "کھڑے ہوگئے۔

احباب نے ان کے اس گراں قدر جذبے کو بہت احترام کے ساتھ دیکھا۔ اور محسوس کیا اور "باری ہاؤس" کے مرکزی ہال تک تشریف لانے سے قبل ہی فیصلہ ہوگیا۔

پیارے قائد کے اس پاک وطن کے باسیوں عزیزی

ثناء سلطان اور برخوردار نوید باری کی نسبت طے پا جانے کا فیصلہ!

وہ شورش.... جو گزشتہ کئی ماہ سے دل کے نہاں خانوں میں برپا تھی۔ وہ اضطراب جو کسی پل چین لینے نہیں دیتا تھا۔ خوشیوں کی اس فضا میں کہیں بہت دور پرواز کر گئے تھے۔

خوشیوں کا اک ہالہ مسز نزہت باری کے گرد رقصاں تھا اور وہ اپنی ذاتی انا کے ہالے سے نکل کر خوشی کے اک جہان میں بڑی اونچی اڑان اڑ رہی تھیں۔ پیارے قائد کی تصویر نے ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔ کرنل کیانی نے اگرچہ فی الوقت زبان سے تو اقرار نہیں کیا تھا۔ لیکن نوید باری کی طرف..... پہلی مرتبہ ان کا جھکاؤ اعلان کر رہا تھا کہ فیصلہ ہو چکا۔ جبکہ لنچ پر مدعو بریگیڈیئر سراج سرگوشی کے عالم میں کرنل کیانی سے کہہ رہے تھے!

"میں تمہیں کمانڈر ہونے کے ناطے یہ حکم بھی دے سکتا تھا کہ تم میری منہ بولی بہن کو مایوس نہیں کر سکتے۔ لیکن میں ہم وطن ہونے کے ناطے تم سے اپیل کروں گا کہ پلیز کرنل کیانی! انہیں تذبذب کی اس کیفیت سے نکال لو۔"

"آپ فکر نہ کریں سر!" کرنل کیانی نے جواباً کہا۔ "ان شاء اللہ بہت بہتری ہوگی۔"

یہ حوصلہ افزا جواب سن کر اک فاتحانہ مسکراہٹ نادر محی الدین کے لبوں پر پھیل گئی۔ انہوں نے تشکر آمیز نگاہوں سے قائداعظم کی تصویر کی طرف دیکھا۔

اس وقت "باری ہاؤس" کے ڈائننگ ہال میں لنچ کرتے ہوئے نوید باری کو ہر مراد پانے کی آرزو میں "سر" "سر" کی گردان کرتے ہوئے کرنل کیانی کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔ وہ روایتی بنگالی ڈشز کی ہر ایک ڈش اٹھا کر آپ یہ لیجیے۔ آپ یہ لیجیے کی تکرار کے ساتھ کرنل سلطان کیانی اور بیگم نور سلطان کے گرد طواف کرتے رہے۔

لنچ کے بعد چائے کا دور چلا اور چائے کے ساتھ میٹھی پنیر لینے کے اصرار پر جب نوید باری نے۔

"نہیں سر ضرور لیجیے۔" کی تکرار شروع کر دی تو کرنل کیانی نے ذرا اک کوفت کے احساس کے ساتھ کہا۔

"برخوردار! آپ مجھے انکل کہہ سکتے ہیں؟"

"بہت بہت شکریہ۔" نوید باری احساس نیاز مندی سے جھک گئے اور مسز نزہت باری کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔

انہوں نے اپنے برادر عزیز کو دیکھ کر واضح اشارہ کیا کہ بس اب دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا۔



ڈھاکہ شہر کے مضافات میں شام اتری تو باری ہاؤس کے اندر خوشی کا اک سماں اتر آیا۔ کرنل کیانی جملہ احباب کے ساتھ آج کے دن کی چند خوشگوار یادیں چھوڑ کر واپس کومیلا جا چکے تھے۔ جبکہ مرکزی ہال میں نادر محی الدین بریگیڈیئر سراج کی موجودگی میں مسز نزہت باری سے کہہ رہے تھے۔

"بہت مبارک ہو بہن! تمہارے ایک ہی لنچ نے مشکل آسان کر دی۔ واہ کیا جادو تھا مہر بخش کے پکائے ہوئے کھانوں میں کہ پہلے ہی مرحلے پر کرنل کیانی کو ایک اجنبی سے عزیزم نوید باری کا انکل بنا دیا۔ بھئی مہر بخش تمہارا بھی جواب نہیں۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں میڈل کی صورت کسی بھی اعلا ترین اعزاز سے ضرور نوازتا۔"

ڈائننگ ٹیبل سے برتن اٹھاتے ہوئے مہر بخش نے نادر محی الدین کی طرف دیکھا۔ اس کا یہ ہم وطن اور ہم زبان شخص جو ان دنوں بنگال کی سیاست پر ابھر کر اسمبلی کی ساری نشستیں اپنی پارٹی "جے بنگال" کے لیے جیت جانے کا عزم رکھتا تھا۔ کس قدر طنزیہ لہجے میں اپنی دوہری شخصیت کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ شخص جو اس مٹی کا باسی ہونے کا دعوا کرتا تھا۔ جس نے اس سرزمین کا نمک کھایا تھا۔ ان دریاؤں کے پانی سے جس کے وطن کی مٹی سیراب ہوتی تھی۔ جو بڑی خاموشی سے اس خطے کے طول و عرض میں بہہ رہے تھے۔ وہ سب سے پہلے ان دریاؤں میں زہر گھولنے کا حامی بن گیا تھا۔ وہ اس سرزمین کو غیروں کے حوالے کرنے کا ضامن تھا۔ جس نے اس کے پیروں کو پناہ دی تھی۔ وہ ان فضاؤں کا دشمن تھا جنہوں نے اس کے سر پر آسمان کو ایک چھتری کی طرح تان رکھا تھا۔ اسے اس سرسبز خطے اور اونچے جھومتے ہوئے اشجار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو فقط اپنے مفادات کا کھیل کھیل رہا تھا اور اس کی سیاست کا یہ زہر آلود رنگ اب ساری قوم کی نجی زندگی میں بھی گھل رہا تھا۔

مہر بخش کچھ نہ بولا۔ وہ کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ ہر غریب محب الوطن بنگالی محنت کش کی طرح وہ صرف اپنے

کام سے کام رکھتا تھا۔ وہ برسوں سے باری ہاؤس کا نمک خوار اور رازدار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مرحوم ڈاکٹر ضیاء الدین باری کی ازدواجی زندگی میں کسی زہریلے ناگ کا کردار ادا کرنے والا ان کا یہ رشتے دار انہیں ایک سخت ترین اذیت سے دوچار کرنے کے بعد باری ہاؤس سے رخصت کرنے کے بعد نہایت ڈیپریشن کے عالم میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرما جانے کے دردناک سانحے کا ذمہ دار تھا۔

اور اب اپنی بہن اور بھانجے کی نام نہاد کفالت کرنے کے بہانے وہ عملاً "باری ہاؤس" کے سیاہ و سفید کا مالک بن چکا تھا۔ اپنی بیگم صاحبہ کو کسی ناکردہ گناہ کی سزا کے طور پر اپنی زندگی سے نکال دینے کے بعد اپنی اکلوتی دختر نیک اختر کی نسبت اپنی مرضی سے طے کرنے کے بعد اب وہ مزید خوش تھا کہ اس نے کرنل کیانی جیسے بااصول شخص کو بھی جیت لیا تھا۔

بلاشبہ اولاد بڑا ظالم رشتہ ہے۔ جب کرنل کیانی نے نوید باری کو اپنی فرزندی میں لینے کا باقاعدہ اعلان کیا تو اپنے دل کے ٹکڑے کی جدائی کے احساس سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ثناء سلطان نے مشرقی بیٹی ہونے کے ناطے اپنے والد گرامی کے اس فیصلے پر لبیک کہا۔ بیگم نور سلطان نے آج تک اپنے مجازی خدا کی ہر بات پر سر تسلیم خم کیا تھا۔ وہ بھلا... زندگی کے اس اہم مرحلے پر کس طرح اختلاف کر سکتی تھیں۔ سو فیصلہ ہو گیا۔

ویسے بھی وہ تابعداری اور ادب و احترام کا ایک ایسا دور تھا۔ جس کی مثال آج کے زمانے میں نہیں ملتی۔ اس دور کی بیگمات کے پاس دلائل کم اور تابعداری زیادہ ملتی تھی۔ وہ اپنی سماجی حیثیت اور مرتبے کو شوہر سے ایک درجہ کم جانتی تھیں۔ اگرچہ مسز نزہت باری جیسی خواتین بھی اس معاشرے کا حصہ تھیں۔ تاہم روایتی گھریلو خواتین اپنے خدائے مجازی کو عقل کل سمجھتے ہوئے اپنی کوئی رائے نہیں دیتی تھیں۔

سو.... اس وقت کے دونوں حسین خطوں پر مبنی ایک وحدت پاکستان کے اس خوب صورت ملاپ کی تصویر کچھ اس انداز سے سامنے آئی کہ جب شام کومیلا شہر کے مضافات میں اتری تو مغربی پاکستان کی بیٹی ثناء سلطان اپنے بابل کے گھر سے رخصت ہو کر مشرقی پاکستان کے فرزند نوید باری کے اس کاشانہ سکون و عفت کی طرف روانہ ہو گئی جہاں اس کا سنہری مستقبل جگمگا رہا تھا۔

اور اس شام کتنے ہی سنہری خواب ان بھیگی پلکوں تلے اتر آئے تھے۔ اپنے بابل کے سینے سے لگ کر الوداعی ملاقات میں آنسوؤں کی برسات چھما چھم برس رہی تھی۔ اور ڈھاکہ کے ڈی سی ہاؤس میں برستی برسات کی طرح کا ایک اور منظر میجر حسن امام کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔

جدائی کے ان لمحات میں دلہن کے علاوہ منزہ میر علی کی آنکھیں بھی بے تحاشا برس رہی تھیں۔ ڈھلتی ہوئی شام کی ان ساعتوں میں اس کا سرخ و سپید چہرہ شفق کی لالی لیے ہوئے بے حد خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ میجر حسن امام اپنے دل کی تمام تر آرزوؤں سمیت اس نظارے میں محو تھا کہ میجر مصطفیٰ نے سرگوشی کی۔

"یار.... اگر یہ محترمہ اپنی کزن کی رخصتی پر اس طرح زاروقطار رو سکتی ہیں۔ تو ذرا سوچو کہ بذات خود اپنی رخصتی پر ان کا کیا حال ہوگا؟"

"تو فکر نہ کر۔" حسن امام نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں چپ کروا لوں گا۔"

"واہ صدقے جاؤں۔" میجر مصطفیٰ نے شوخی سے کہا۔

"کیا بلا کی خود اعتمادی ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تیرے باجے بجوانے کے لیے میں کل ہی ویسٹ پاکستان کوچ کر جاؤں۔"

"دعوا نہ کر۔ اگر دوست ہے تو عمل کر کے دکھا۔"

حسن امام نے بے نیازی سے کہا۔ تو میجر مصطفیٰ نے تقریباً جل کر جواب دیا۔

"تو بھول رہا ہے کہ میں تیرا چیلنج قبول کر چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" حسن امام نے گویا کہ بات ختم کر دی۔

"میں انتظار کروں گا۔"

ثناء سلطان کی رخصتی کے بعد مینامتی کنٹونمنٹ کی ساری فضا اداس ہو گئی۔ کرنل سلطان کیانی کا اصرار تھا کہ ڈھاکہ سے آئے ہوئے احباب ڈنر کے بعد میس تشریف لے جائیں۔ جہاں ان کا قیام گزشتہ رات سے تھا۔ بیشتر احباب اگرچہ کہ اب اجازت لینا چاہتے تھے۔ تاہم میزبان کی آزردگی کے پیش نظر رک جانے کی حامی بھر لی گئی۔

بس.... فقط چند لمحات کے لیے ہی تو اندر کا منتشر جہاں پر سکون ہوا تھا کہ سوچی ہوئی آنکھوں اور گلال چہرے کے ساتھ وہ پھر سامنے آ گئی۔ اب کی بار سادگی کا عجب رنگ تھا۔ لباس سادہ تھا اور سراپا دل فریب۔ اس وقت ایک عجب ادائے بے نیازی کے ساتھ خواتین میں چائے سرو

کرتے ہوئے منزہ میر علی بھرا بھابھی سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے مشرقی پاکستان بے حد پسند آیا ہے۔ دل چاہتا ہے یہیں مقیم ہو جاؤں۔"

"تو بھئی تمہارا کام تو ہو گیا۔" میجر مصطفےٰ نے شرارت سے حسن امام کو اشارہ کیا۔ وہ جواباً "اسے گھور کر رہ گیا۔

میجر مصطفےٰ محتاط انداز میں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ رات ڈنر سے واپسی تک جب ان کی خاموشی برقرار رہی۔ تو حسن امام کو کوفت ہونے لگی۔ لیکن جب میس کے کمرے میں آتے ہی وہ قدرے مایوسی کے عالم میں سر جھکا کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ تو میجر مصطفےٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"برادر عزیز! تو سوچ کی کن گھمن گھیریوں میں پڑا ہے۔ چل اٹھ۔ آرام فرمالے۔ صبح سویرے ڈھاکہ کے لیے روانگی ہے۔"

"یار! میں سوچ رہا ہوں۔" حسن امام نے سنجیدگی سے کہا۔ "مغربی پاکستان جا کر اماں کے حضور حاضری دینے سے پہلے کیوں نہ پہلے یہاں کرنل کیانی سے ریکوسٹ کی جائے!" میجر مصطفےٰ نے چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تو گویا اب معاملہ نہایت سنجیدہ رخ اختیار کر چکا تھا۔ محترمہ منزہ میر علی نے برخوردار میجر حسن امام کے دل و دماغ کو مکمل طور پر گرفت میں لے کر اب انہیں کسی بھی قابل نہیں چھوڑا تھا۔ آج کی دید کے بعد تو ان کی ہر بات اسی ذکر سے شروع ہو کر اسی ذات شریف پر ختم ہو رہی تھی۔ اور میجر مصطفےٰ کے نزدیک یہ لمحہ فکریہ تھا۔

"بہت پچھتاؤ گے۔" میجر مصطفےٰ نے برجستہ کہا۔ "کیا تم نے سنا نہیں کہ موصوف نے اسی ہی قسم کے کیس میں مسز نزہت باری کو عرصہ سوا سال تک کس طرح چکر میں الجھائے رکھا۔ تب کہیں جا کر آج شام وہ ڈولی رخصت ہوئی ہے۔ جس پر تیری ہیر نے بھی 'چیکاں' (چیخیں) مار کر تجھے مزید اداس کر دیا ہے۔ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ مغربی پاکستان جا کر وارث شاہ کی اس ہیر کے وارثوں کو تلاش کرنے کے بعد یہ مقدمہ ان کی عدالت میں پیش کر دیا جائے۔"

حسن امام کچھ نہ بولے۔ انہوں نے جا کر وضو کیا اور نماز عشاء کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد بہت دیر تک دعا کرتے رہے اور جب وہ میجر مصطفےٰ کو خدا حافظ کہہ کر لیٹ گئے۔ تو میجر مصطفےٰ نے دیکھا کہ کچھ ہی دیر کے بعد وہ پرسکون نیند سو رہے تھے۔

تب میجر مصطفےٰ نے سوچا۔ "خدایا! کیسی ہوتی ہیں یہ آدرش اور آرزوؤں کی پریاں۔ مضبوط دل اور مضبوط وجود کو اپنی ایک جھلک دکھا کر کس طرح موم کر دیتی ہیں۔ کس طرح سے خوابوں کی دنیا میں اترتی ہیں اور انسانی من کے اندر اک دھوم مچا دیتی ہیں۔ مرد ذات کے ازلی ضدی وجود کو کبھی تو ماں بن کر اپنے دامن میں پناہ دیتی ہیں۔ کبھی بہن بن کر رحمت کا آسمان بن جاتی ہیں۔ اور کبھی شریک حیات بن کر صحن چمن میں رنگ بکھیر دیتی ہیں۔ انسانی زندگی کے وسیع صحرا میں ہر دکھ اٹھا کر ہر تکلیف سہہ کر نسل انسانی کی پرورش کرتی ہیں۔ ننھے منے وجود کو جوانی کی منزل تک لاتی ہیں۔ اور پھر وقت پورا ہو جانے پر وفاؤں کا درس دیتے ہوئے اپنے رب کے حضور سرخرو ہو جاتی ہیں۔ مولائے کریم! تیری دنیا کا یہ ایک اہم کردار۔ کتنا معتبر ہے۔ جو اپنے کمزور وجود کے باوصف بھی صنف قوی کی نیندیں اڑا دینے کی قوت رکھتا ہے۔"

بہت دیر..... کے بعد نیند میجر مصطفےٰ کی آنکھوں کا نصیب بنی۔ صبح سویرے فجر کی نماز کے بعد وہ صدق دل سے حسن امام کی خوشیوں کے لیے دعا گو رہے۔

✽ ✽ ✽

ڈھاکہ واپسی کے سفر میں خاموشی ناگزیر تھی کہ بریگیڈیئر سراج کے علاوہ کیپٹن شاہ پال بھی ہم سفر تھے۔ جبکہ میجر نگین تاج اپنی اہلیہ کے ہمراہ اپنی ذاتی گاڑی میں ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ واپس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر جب بریگیڈیئر سراج نے ڈاک دیکھی تو ان کا موڈ بے حد خراب ہو گیا۔ انہیں چار دن کے بعد G.H.Q جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی طلب کیا گیا تھا۔

"لیکن کس ضمن میں؟" ان کے اس سوال کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ لیکن میجر مصطفےٰ اور حسن امام جانتے تھے کہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے وفد کو بریفنگ دیتے ہوئے بریگیڈیئر سراج نے نادر محی الدین کی اس شہہ پر کہ "کچھ نہیں ہو گا۔" تقسیم بنگال کے حوالے سے تاریخ ہی نہیں جغرافیہ بھی بدلنے کی بات نہایت کھلے لفظوں میں کہہ دی تھی۔ نیز ان کا خیال تھا کہ دو قومی نظریہ اس دور کا نظریہ ضرورت تھا۔ اس دور کا نہیں۔ لہٰذا بنگال کی دوری کو قطعی طور پر غیر فطری قرار دیتے ہوئے ان کا

خیال تھا کہ آج کی سیاست کو اس حقیقت کو قبول کر لینا چاہیے کہ آج کے ذہنوں کی یہ سوچ درست ہے کہ "جیسے بنگال" جیسی تحریک کے بانی راہنما کے تمام نکات اور اصول درست تسلیم کر لیے جائیں۔"

وفد کے محب الوطن جذباتی اراکین کو یہ انداز بالکل پسند نہ آیا۔ وہ تو یہ خلیج پاٹنے اور دوریوں کا احساس مٹانے آئے تھے۔ چونکہ اطلاعات کے مطابق علیحدگی کا زہر آہستہ آہستہ نئی نسل کے وجود میں سرایت کر رہا تھا۔ لیکن یہاں آ کر انہیں احساس ہوا کہ نئی نسل تو اس آگ سے ابھی فاصلے پر ہے۔ لیکن ذمہ دار افراد تو ان سے قبل ہی ان انگاروں پر چلنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جو انگارے اپنے دامن میں بے شمار چنگاریاں لیے ہوئے سرزمین بنگال کے چپے چپے پر بکھرنے والے ہیں۔ چنانچہ حکومت نے محترم صدیقی صاحب کی اس رپورٹ کا بے حد نوٹس لیا۔ جس میں آنے والے دنوں کے حوالے سے خوفناک خدشات کا اظہار کیا گیا تھا۔

ڈھاکہ چھاؤنی میں سہ پہر ڈھل کر شام کا روپ دھارنے والی تھی۔ کومیلا سے ڈھاکہ تک کے سفر کی تھکن ابھی اتری نہیں تھی کہ بریگیڈیئر سراج کے حضور سے بلاوا آ گیا اور جب شام ہیڈ کوارٹر کے اطراف میں اتری۔ تو وہ دونوں بریگیڈیئر سراج کے آفس میں مجرم بن کر بیٹھے ہوئے تھے اور بریگیڈیئر صاحب انہیں نہایت شاندار جھڑکیوں سے نواز رہے تھے۔

"ہم نے سچ بولا اور ہم ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے کیا سمجھتا ہے۔ یہ تمہارے مغربی پاکستان والا اور یہ شالا صدیقی صاحب۔ اس نے کیا رپورٹ پیش کی اپنی گورنمنٹ کو۔ کیا سمجھتا ہے خود کو۔ کیا میرا کورٹ مارشل کروانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میری پہنچ بہت دور تک ہے۔"

وہ مسلسل بول رہے تھے۔ لفظ بے ربط اور لہجہ درشت تھا۔ پھر اچانک وقت مہربان ہوا اور انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں ویسٹ پاکستان جاؤں گا اور آپ دونوں بھی میرے ساتھ چلیں گے۔ اگر کچھ دن رکنا چاہیں تو چھٹی لے لیں۔ میجر شمس اور وحید ادھر کام سنبھال لیں گے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔"

انہوں نے حسب عادت اس جملے کے ساتھ کہ "دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔" کہہ کر بات ختم کر دی۔

بے حد آزردہ دل کے ساتھ وہ دونوں آفس سے باہر آئے۔ باہر شام کا دھندلکا اب رات کی سیاہی میں ڈھل جانے کو تھا۔ ڈھاکہ پوسٹنگ کے بعد سے گزارے گئے بے شمار دنوں کے برعکس آج یہ بدمزگی کا پہلا نقطہ آغاز تھا۔

جہاں حسن امام اور مصطفےٰ کمال کے ذہن میں یہ سوچ ابھری کہ ان تمام معاملات سے متعلقہ ہونے کے باوجود کمانڈر صاحب نے صرف انہیں ہی کیوں طلب کیا؟ میجر نگین تاج کیوں بری الذمہ ٹھہرائے گئے۔ ذمہ داریوں کے لحاظ سے تو تینوں ایک ایسی مثلث کی مانند تھے، جس کے کسی بھی ایک کونے کے بگاڑ کی صورت میں زندگی کا زاویہ بگڑ جانے کا شدید خدشہ ہوتا ہے۔

میجر مصطفےٰ اپنی لاابالی طبیعت کے باعث چاہتے تھے کہ بریگیڈیئر سراج کے کسی قدر درشت رویے کو بھول کر میس کی راہ اختیار کر لی جائے اور فی الوقت صلح یا ناراضی کو فراموش کرتے ہوئے اس بات پر چھوٹا موٹا جشن منا لیا جائے کہ بالآخر قدرت نے مہربانی فرماتے ہوئے چند دنوں کے لیے ہی سہی مگر مغربی پاکستان کا دانہ پانی اور ان کے پیاروں کی دید ان کے نصیب میں لکھ دی ہے۔

اگر کمانڈر ہونے کے ناطے بریگیڈیئر سراج نے اپنے غم و غصے کا اظہار کر بھی دیا تو کوئی بات نہیں۔ کمال مہربانی چھٹی لینے کی اجازت بھی تو عنایت فرما دی۔ لیکن حسن امام کا خیال تھا کہ ابھی اسی وقت میجر نگین تاج کے گھر جا کر اس سارے معاملے کو ڈسکس کیا جائے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ کوئی عام بات نہیں تھی۔ نہایت اہم اور نازک معاملہ تھا۔

"یار! سمجھ میں نہیں آتا کہ رات گئے تک دفتر کی جان نہ چھوڑنے والے کمانڈر صاحب نے آخر اتنی فراخدلی سے چھٹی جیسی اہم مراعت کی اجازت کس طرح دے دی۔ یہ تو ایک معجزہ ہے معجزہ۔ اور ہمیں اس پر رب کریم کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"شکر تو ہم ضرور ادا کریں گے۔" حسن امام نے کہا۔

"لیکن مجھے تو اس وقت صدیقی صاحب پر بہت غصہ آ رہا ہے انہیں تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔"

"برادر عزیز!" مصطفےٰ کمال نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"اس شخص پر غصہ کرتے ہوئے تو یہ مت بھول کہ یہی بندۂ خدا تیرے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں اہم رول ادا کر

سکتا ہے۔"
"کچھ بھی ہو۔" حسن امام نے کہا۔
"میرے لیے میرا وطن میری ذاتی زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"
"بات تو بالکل درست ہے۔" میجر مصطفےٰ نے جواباً کہا۔
"اس وفد کی ناراضی کے حوالے سے بریگیڈیئر سراج کی طلبی ایک اہم نکتہ ہے۔"
"یقیناً"۔ حسن امام نے کہا۔ "ہمیں یہ امر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ چھوٹی چھوٹی چنگاریاں ہی مل کر ایک بہت بڑے الاؤ کا موجب بنتی ہیں۔"
یہاں ذاتی زندگی سے ہٹ کر مسئلہ چونکہ قومی سلامتی کا تھا۔ لہٰذا آرام کے لمحات کو نظرانداز کرتے ہوئے رات گئے تک میجر تمکین تاج کے ہاں کافی کے کپ پر بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔
"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ امن خیرخواہی اور ملکی سلامتی کی اظہار تمنا کا آورش لے کر آنے والوں کو ہماری طرف سے واضح لفظوں میں یہ پیام دیا گیا کہ "یومسٹ شٹ اپ ود یور بلڈی تھنکنگ۔"
"You must shut up with your Bloody thinking"۔
اب ہم اپنی مرضی کرنا چاہتے ہیں۔" میجر تمکین تاج نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"سول تک تو بات بالکل درست رہی۔ لیکن فوج کے حوالے سے بریگیڈیئر صاحب نے بریفنگ دیتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ وقت اور فاصلے کے لحاظ سے دونوں خطوں کے درمیان جو واضح فرق ہے۔ اگر یہ فرق دو الگ ملکوں اور حکومتوں میں بدل جائے تو ہمیں اس تقسیم کو بھی اسی خوشدلی سے قبول کر لینا چاہیے۔ جس خوش دلی سے برصغیر کی تقسیم کو قبول کر لیا گیا۔ اور جس کے نتیجے میں ادھر کی دنیا ادھر ہو گئی۔ گھربار لٹے عصمتیں پامال ہوئیں۔ اور دھرتی لہو رنگ ہو گئی۔
اگر ہم تاریخ کے اس جبر کو آزادی کا نام دے سکتے ہیں تو پھر یہ آزادی ان کا بھی حق بنتی ہے جنہیں اپنے حقوق غصب ہونے کا شکوہ ہے۔ بے شک یہ ایک فردِ واحد کی سوچ ہے اور میں جانتا ہوں کہ نادر محی الدین نے اپنی یہ سوچ ان کے ذہن میں ڈال دی ہے۔ وہ بہت عرصے سے اپنے اس سیاسی لیڈر کی زبان بول رہے ہیں۔ صدیقی صاحب کی ناراضی درست ہے۔ حکومت وقت کو یقیناً" اس کا نوٹس لینا چاہیے تھا۔
نادر محی الدین اور بریگیڈیئر سراج کی سوچ اور نکتہ نظر ان کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ ساری قوم کا اس سے متفق ہونا قطعی ضروری نہیں۔ زندہ فعال اور متحرک قوموں کے درمیان اس قسم کے معاملات چلتے رہتے ہیں۔ تحریکیں چلتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے بزرگوں کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ ان شاءاللہ بہتری ہو گی۔ آپ دونوں آزردہ نہ ہوں۔" میجر تمکین تاج نے انہیں تسلی دی۔
"اگلے چار دنوں میں تیاری کے بعد ویسٹ پاکستان روانہ ہو جائیں۔ ان شاءاللہ ہم بہت بہتری کی امید رکھتے ہیں۔"
رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ جب وہ دونوں اپنے وفادار اور محب الوطن ساتھی میجر تمکین تاج کے گھر سے رخصت ہوئے۔ ڈھاکہ چھاؤنی کی فضا خاموش تھی اور فضا پراسرار سڑکیں خاموش تھیں اور در و دیوار پر اک عجیب سی سنسناہٹ کا احساس نمایاں تھا۔ میس تک آتے ہوئے مصطفےٰ کمال نے کہا۔
"کتنی خاموشی ہے حسن امام!" "اور مجھے کبھی کبھار یہ خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔ ہمیں کسی چھوٹے سے چھوٹے نکتے کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے!"
"بریگیڈیئر سراج کی جی ایچ کیو میں طلبی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔" حسن امام نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
"لیکن ہم پر اعتماد ہیں کہ میجر تمکین تاج جیسے وفادار ساتھی ہمارے ساتھ ہیں۔"
اور... اس شب یہ نیند کی پہلی پرواز تھی جو ان کی زندگی سے ہجرت کر گئی۔ کچھ بھی سہی۔ لیکن ذہنوں کے خدشات حقیقت کا روپ دھارتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے کہ صبح کے معمولات میں ٹی بریک کے دوران کیپٹن شاہ پال نے مدھم آواز اور آزردہ لہجے میں انکشاف کیا۔
"سر! آج جیسور سے ایم آئی "ملٹری انٹیلی جنس" کے کرنل حق نواز کیانی ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ انہوں نے نادر محی الدین کی ایک ٹیلیفون کال ٹیپ کی ہے جو کہ انتہائی قابل اعتراض نکات پر مبنی ہے۔ وہ اس ضمن میں مغربی پاکستان رپورٹ روانہ کرنے سے پہلے ہم سب سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

اب جبکہ مغربی پاکستان روانگی میں فقط تین روز باقی تھے۔ اور ابھی مناسب تیاری کے مراحل درپیش تھے اس انتہائی حساس معاملے نے سب ہی کو فکرمند کر دیا۔
کرنل حق نواز کیانی سہ پہر چار بجے ڈھاکہ پہنچے اور بریگیڈیئر سراج کو مطلع کیے بغیر انہوں نے اپنے قابل اعتماد احباب کے علاوہ میجر تمکین تاج کو بطور خاص مدعو کیا۔ تاکہ محب وطن اور قابل اعتماد ساتھی ہونے کے ناطے وہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے کے ضمن میں اپنی رائے دے سکیں۔
پھر جب کیپٹن شاہ پال نے نادر محی الدین کی گفتگو کا ترجمہ سنایا۔ تو سب ہی ششدر رہ گئے اور سب ہی ذہنوں میں ایک ساتھ یہ سوال در آیا کہ کیا اب وہ وقت تمام ہوا جبکہ دل کی گزرگاہیں ایک دوسرے کی زندگی کے گلی کوچوں سے ہو کر گزرا کرتی تھیں۔ کیا اب دل کے دروازے بند ہو جانے کے قریب تھے؟ نفرتیں زندگی کی شاہراہ پر پھیل رہی تھیں اور سرحد کی لکیریں ادھر سے کھول دینے کے بعد ادھر سے بند کرنے کی صدائیں آ رہی تھیں۔ کیا اب دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق کر دینے کی دھمکی دینے والے لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے جا رہے تھے انہوں نے شاید برین واشنگ کر کے نادر محی الدین جیسے لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا۔
قابل اعتماد احباب کی اس مجلس میں میجر تمکین تاج کے اردلی کی اس بات کا بھی زبردست نوٹس لیا گیا جو اس نے چند ماہ پہلے اپنی "لنگر گپ" کے دوران حسن امام کے اردلی سے کہی تھی کہ۔
"وقت آ گیا ہے۔ اب ہم ان شاءاللہ پنجابی افسروں کے بوٹ پالش نہیں کرے گا۔"
حسن امام کے اردلی نواب دین نے نہایت آزردگی کے عالم میں یہ بات اپنے صاحب کے گوش گزار کی تھی۔ انہوں نے تو سنجیدگی سے اس کا نوٹس لینا چاہا۔ مگر مصطفےٰ کمال نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ یہ ایک لایعنی مفروضے پر مبنی بات ہے۔ جو "لنگر گپ" کے دوران میجر تمکین تاج کے اردلی وزیر علی نے کہہ دی ہے۔ ادھر ادھر سے ابھرتی ہوئی سیاسی جماعت "جیے بنگال" کی شہرت سن کر اس نے ایسا کہہ دیا۔ ورنہ وزیر علی کہاں کا دانشور ہے کہ ایسے اہم اور سنجیدہ موضوعات پر بات کر سکے۔ جبکہ حسن امام کے خیال کے مطابق یہ اس کی ذاتی رائے تھی۔
چونکہ ایک اطلاع کے مطابق وہ بھی کبھار دوست احباب میں پھبتی بگھارنے کے لیے نادر محی الدین کے ساتھ ڈاک خانہ ملاتے ہوئے اپنے آپ کو اس کا رشتے دار گردانتا تھا۔ کچھ بھی سہی... لیکن اب بریگیڈیئر سراج کا رویہ، نادر محی الدین کی گفتگو اور میجر تمکین تاج کے بیٹ مین وزیر علی کا بولا گیا جملہ سب ہی کے ذہنوں میں سوالیہ نشان بن کر اک الجھن کا رخ اختیار کر چکا تھا۔
انتہائی اہم اور حساس نوعیت کی میٹنگ ختم ہوئی تو کیپٹن شاہ پال انتہائی مضطرب کیفیت میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ میز پر لیٹ ڈاک سے موصول وہ لفافہ موجود تھا جو مغربی پاکستان کی تحصیل گوجر خان کے ایک نواحی قصبے سے آیا تھا اور جس میں لکھنے والے نے "بے جی" کے جذبات کی عکاسی کچھ اس طرح کی تھی۔
"تم بہت یاد آتے ہو شاہ پال! کب چھٹی آؤ گے؟ آج کل موسم بدل رہا ہے۔ شام کے وقت میرا دل بہت اداس ہو جاتا ہے۔ تمہاری بہن اور اس کی ننھی گلی اور تم میری زندگی کے لیے تم ہی لوگ تو سہارا ہو۔ تمہاری دوری اب برداشت نہیں ہوتی۔ جلدی آجاؤ گلی تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔"
اور چھ سالہ گلی نے اپنے پیارے پیارے ماموں کے لیے اس خط میں گلاب کی کلیوں کا تحفہ ارسال کیا تھا۔ خط کھولتے ہی سوکھی ہوئی گلابی کلیاں میز پر بکھر گئی تھیں۔ اس نے احتیاط کے ساتھ انگشت شہادت سے ان کلیوں کو چنا اور لفافے میں ڈال کر لفافہ الماری میں رکھ دیا۔ الماری کے پٹ کھولتے ہی بے جی کی تصویر سامنے آ گئی۔
بارعب اور باوقار چہرہ۔ لبوں پر ممتا سے لبریز مسکان آنکھیں روشن چہرہ گلی ان کی گود میں بیٹھی کھلونا ہاتھ میں لیے مسکرا رہی تھی اور یہی تصویر شاہ پال کی زندگی تھی۔
وہ... تو بہت چھوٹا تھا۔ فقط چند ساعت ہی سانسوں کا نصیب بنے تھے کہ پاؤں کی جنت روٹھ گئی تھی۔ اس کی تخلیق کا مرحلہ زینت بیگم کی زندگی کو ابدی منزل کی سمت لے گیا۔ حیات سے منہ موڑتے ہوئے ان کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں نے کانپتے لبوں سے اپنی ماں سے التجا کی۔
"بے جی... امیر اچھے... اللہ کے بعد آپ کے حوالے!"
اور پھر زندگی روٹھ گئی تھی۔
بھلا کیا دیکھا تھا زینت بیگم نے! جوانی کی چند بہاریں اور چند سالہ ازدواجی زندگی کے بعد بیوگی کا وہ صحرا جس میں باپ

کی بشارت کے چار ماہ بعد شاہ پال صحن چمن میں خوشیوں کا پیام بن کر آیا۔ لیکن آنکھیں اسے دیکھ نہ سکیں۔ فقط کانوں نے سنا کہ اک وارث نے جنم لیا ہے۔ لرزتے کانپتے وجود کے ساتھ بے جی سکتے کے عالم میں کھڑی اپنی اس اولاد کو دیکھتی رہ گئیں۔ جس نے اب ایک لاشے کا روپ دھار لیا تھا۔ انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں اور آزردہ دل کے ساتھ زینت بیگم کی آخری رخصتی کے تمام مناظر کو دیکھا۔ سنہری دھوپ جب ان کے در و بام سے رخصت ہوئی تو زینت بیگم بھی اپنی آخری منزل تک پہنچ چکی تھیں۔ کمال ضبط اور حوصلے کے ساتھ بے جی نے مٹی کے اس ڈھیر کو دیکھا۔ اور پھر اس ننھے سے وجود کو اپنے ناتواں ہاتھوں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگالیا۔

بڑی بہن زینب کم عمری میں ہی یک دم بڑی.... بہت بڑی ہو گئی۔ شریف النفس ددھیالی رشتے داروں نے وراثت میں سے حصہ عنایت فرمایا۔ تایا نے دست شفقت سر پر رکھا اور اس طرح پرورش کے راستے آسان ہو گئے۔

وہ چلنے لگا تو زندگی اس کے سنگ سنگ چلنے لگی۔ برآمدے سے باہر صحن تک قدم بہ قدم چلتے ہوئے جب وہ اپنی توتلی زبان میں بے جی کو پکارتا۔ تو جینے کی امنگ اور توانائی ان کے کمزور و ناتواں وجود کے اندر سرایت کر جاتی۔ ماضی کی خوشگوار یادوں تلے دبی ہوئی بے جی دوبارہ جی اٹھتیں۔ اسے سنبھالتے ہوئے کھلاتے پلاتے اور سلاتے وقت بے جی کے لب دعاؤں سے آباد رہتے۔ وہ نیند سے بیدار ہوتا تو باہر برآمدے میں آکر آواز لگاتا۔

"بے جی آپ کہاں ہیں؟" اور کسی بھی کام میں مصروف بے جی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سامنے آجاتیں۔ دنیائے رنگ و بو سے بے نیاز یہ دونوں روحیں اپنی ہی محبت کے جہان میں جیتی رہیں اور زینت بیگم کی اس روح نے بچپن سے لڑکپن اور پھر بلوغت کی ابتدائی منزلیں طے کر لیں۔

سابقہ فوجی تایا محمد خان جو اس زمانے کی تمام وضع داری اخلاص اور رواداری کو اپنے اندر سمیٹ کر اب بزرگی کی منزل پر تھے۔ اسے اپنے ساتھ لے کر اپنے "ڈیرے" پر آ بیٹھتے۔ گاؤں کے مرکز میں واقع اس "ڈیرے" پر بنی ایک بیٹھک میں ماضی کی یادوں کا ایک سیلاب امڈ آتا۔

بزرگوں کی اس مجلس میں گزرے ہوئے دور کی شجاعت سے بھرپور داستانیں سنائی جاتیں اور اپنے تجربات کی روشنی میں نوجوانوں کو آئندہ زندگی کے راستے متعین کرنے کی ہدایت کی جاتی۔ رات گئے تک "ڈیرہ" آباد رہتا۔ تایا محمد خان کے گلے میں قدرت نے سوز کا عجب رنگ بھرا تھا۔ وہ بزرگوں کی فرمائش پر "میاں محمد بخش" کا کلام "سیف الملوک" سناتے اور مجلس جھوم جھوم جاتی۔ بطور خاص وہ یہ مصرع بار بار دہراتے۔

"لا پریت محمد بخشا جگ دج رہی کہانی۔"

زندگی ذرا آگے بڑھی۔ تو یہ مصرع شاہ پال کی زبان پر ایک ورد کی صورت میں آگیا۔ وہ بولنے سے جاننے اور پھر سمجھنے کے دور میں داخل ہوا۔ تو یہ مصرع جیسے زندگی کے گرد ہالہ بن گیا۔ گاؤں کے اسکول سے آٹھ جماعتیں پاس کرنے کے بعد تایا محمد خان نے اسے ملٹری کالج جہلم میں داخل کروادیا۔

یہ بے جی سے جدائی کا پہلا مرحلہ تھا جو بے حد گراں گزرا۔ وہ رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں اور وہ بھی کہ خود کو بے جی سے جدائی بے حد گراں گزر رہی تھی۔ اپنے اندر کی کیفیت کو ضبط کرتے ہوئے صبر کی منزل سے گزر رہا تھا۔ تایا محمد خان نے اپنی کھری طبیعت کے باعث ایک دم کہہ دیا۔

"بہن جی! یہ چند میل کے فاصلے پر تو ملٹری کالج ہے۔ کون سا کوئی لام (جنگ) پر جارہا ہے۔ آپ حوصلہ رکھیں نہ" اور نہایت کم گو دھیمے لہجے میں بات کرنے والی بے جی نے بھی قدرے غصے سے کہہ دیا۔

"یہ آپ نے اس کے لیے جو راستہ چنا ہے ناں۔ تو یہ راہیں لام کی طرف ہی جاتی ہیں۔ میں رہوں یا نہ رہوں زندگی میں کوئی نہ کوئی لام اس کا مقدر ضرور بنے گا۔"

"تو پھر کیا ہوا۔" تایا محمد خان نے جوش اور جذبے سے کہا۔ "یہ غازیوں اور شہیدوں کی سرزمین ہے۔ ہمارا آبائی پیشہ سپاہ گری ہے۔ ہماری اس سرزمین نے غازیوں کو اپنی گود میں پناہ دی ہے۔ اور شہداء کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ ہم اپنی اولاد کو بزدلی کا سبق نہیں دے سکتے۔ قدرت نے غازی یا پھر شہید کا راستہ ہمارے لیے متعین کر دیا ہے۔ آپ اپنے آنسوؤں سے اس کا حوصلہ نہ توڑیں۔ دکھی دل سے اس کا راستہ نہ روکیں۔ ورنہ یہ اپنے مقصد سے ہٹ کر کچھ نہیں کر سکے گا۔"

اور۔۔۔ بے جی نے اپنے آنسو ضبط کر لیے۔

وہ بذات خود بھی تو انہی راہوں کی مسافرت اختیار کرنا

چاہتا تھا۔ شعور کی ابتدائی منزل پر ہی تایا محمد خان کے "ڈیرے" پر منعقد مجالس میں بزرگوں سے شجاعت کی داستانیں سن کر وطن سے محبت بڑھ گئی۔ حب الوطنی کے عظیم احساس سے رگ و پے میں یہی عزم سرایت کر گیا کہ۔

"میں فوجی بنوں گا۔"

جب بھی کسی جگہ ناانصافی دیکھتا تو اپنے مخالف پر دست اندازی کا عمل لاگو کرنے کے بعد دونوں ہاتھ جھاڑ کر کہتا۔

"میں فوجی ہوں۔"

اسکول سے اکثر شکایات آتیں۔ تایا محمد خان کے لحاظ سے اکثر بچاؤ ہو جاتا۔ کھیل کے میدان میں اک نمایاں حیثیت رکھنے کے باوجود وہ اکثر اپنے ساتھیوں سے کہتا۔

"آؤ جنگ جنگ کھیلیں۔"

اور شاہ پال کیانی کی زندگی کا مرکزی زاویہ نگاہ تایا محمد خان کے ڈیرے کے اندر ٹنگی اپنے شہید باپ کی وردی اور رائفل تھی۔ آبروئے وطن کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ دینے کے بعد وہ اپنی نشانیاں اس سرزمین کے حوالے کر کے خود اللہ پاک کے حضور سرخرو ہو گئے تھے۔ ان نشانیوں نے شاہ پال کے دل میں سما کر اس کی زندگی کا راستہ متعین کر دیا تھا۔

اس کے قدموں نے آبائی گاؤں سے ملٹری کالج تک کا فاصلہ طے کر لیا اور پھر یہ راستہ اسے پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول تک لے گیا۔ ایک یکسر بدلی ہوئی شخصیت کے طور پر جب وہ پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد گاؤں آیا۔ تو مبارک باد کی ساعتوں میں زندگی مسکرا اٹھی۔

گاؤں کے کھیتوں میں لہلہاتے سرسوں کے پیلے زرد پھولوں کی طرح خوشیاں ہر سمت سے برسنے لگیں۔ گھر کے اس برآمدے میں.... جہاں سے اس کی زندگی نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا۔ ذرا دیر رک کر۔ کچھ لمحے ٹھہر کر جب اس نے اپنی بے جی اور تایا محمد خان کو سیلوٹ کیا۔ تو ہر ذی نفوس کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی اور اک بہادر اور جری شہید کی اولاد نے اس کی نشانی پاک فوج کی وردی پہن کر اپنے خوابوں کی تعبیر پالی۔

یہ یقین عمل اور وحدت کا وہ سفر تھا۔ جس سفر پر وہ بڑی کامیابی سے گامزن ہو گیا۔ آکاش پر زینت بیگم کی روح مسکراتی رہی اور زمین پر بے جی اس پر اپنی چاہتوں کے پھول نچھاور کرتے ہوئے ایک سوال کرتی رہیں۔

"تو رضامندی دے تو تیری شادی کر دوں۔" وہ ان کی التجا کے جواب میں مسکرا کر جواب دیتا۔

"بے جی مجھے فی الحال فوج والوں کی طرف سے اس کی اجازت نہیں۔ ابھی تو میں ان کے نزدیک بہت چھوٹا ہوں۔"

"تو فوج والے اس کی اجازت کب دیں گے۔ جب تو بوڑھا ہو جائے گا تب؟" وہ مصنوعی غصے سے پوچھتیں۔

"بھیا!" زینب درمیان میں بول اٹھتی۔ "کچھ ناک نقشہ تو بتاؤ۔ کیسا ہونا چاہیے؟"

"بس آنکھیں بڑی بڑی ہوں اور بال بہت لمبے!" وہ اپنا آئیڈیل پیش کرتا۔

"کتنی بڑی بھیا!" زینب شرارت سے صحن کے آخری کونے میں بندھی ہوئی بھینس کی طرف اشارہ کرتی۔

"کیا ہماری اس کلو کی آنکھوں سے بھی بڑی؟"

"نہیں اس سے ذرا کم۔ میرا مطلب ہے کہ میڈیم سائز۔" وہ اپنی رائے پیش کرتا۔

"اور بال کیا کلو کی دم جتنے ہوں۔ یا اس سے بھی زیادہ لمبے!" زینب شرارت سے مسکرا کر پوچھتی۔

"میرا خیال ہے کہ بال تو اس کی دم کے برابر ہی ہونے چاہئیں۔ تاکہ بوقت ضرورت پکڑ کر مار کٹائی کرنے میں آسانی رہے۔" وہ بھی شرارتی لہجے میں جواب دیتا۔

"ہمارے ہاں مردانگی کا ایک اعلا ترین وصف یہ بھی تو ہے کہ شدید غصے کے عالم میں چوٹی سے پکڑ کر پیاری راج دلاری بیوی کی دھنائی کر دی جائے اور پھر بندہ بزرگوں کے جرگے میں صاف مکر جائے کہ جناب والا میں تو اس موقعۂ واردات پر موجود ہی نہیں تھا اور یہ اہم کارنامہ سر انجام دینے کے لیے ایک عدد لمبی والی چوٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اللہ بھیا تم کوئی ایسے ہو؟" زینب لاڈ سے کہتی۔ "وہ تو اور طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔"

"کوئی اور طرح کے لوگ نہیں ہوتے۔" وہ جان بوجھ بے جی کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں کہتا۔ "اندر سے سب ہی ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ صرف ان کے قد میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹے قد کا ہوتا ہے اور کوئی بڑا تم نے دیکھا نہیں۔ تایا جی بزرگی کے اس دور میں بھی اپنی تمام تر وضع داریوں سمیت بھی کبھی کبھار ان واقعات کا ذکر کس قدر خوشی کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ جبکہ وہ ازدواجی زندگی کے اکثر کسی نازک مقام پر انتہائی غصے کے عالم میں

تمبرتوڑ حملہ کرنے کے بعد گرج کر تائی اماں کو حکم دیتے تھے۔

"چل میرے باپ دادا کی حدود میں سے باہر نکل جا۔"

اور وہ روتے ہوئے کئی کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اپنے میکے چلی جاتیں اور جب راضی نامے کے لیے باقاعدہ پنچایت تشکیل دی جاتی تو تایا جی صاف مکر جاتے۔ سو میری پیاری آپی! میرا بھی پروگرام اپنے بزرگوں کی اس روایت کو زندہ رکھنے کا ہے۔ تم برائے مہربانی بے جی کے ساتھ مل کر بڑی بڑی آنکھیں اور دو گز لمبی چوٹی ضرور تلاش کرنا تاکہ مجھے مستقبل میں اپنے اس عظیم الشان پروگرام پر عمل در آمد کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔"

وہ اپنی تقریر ختم کرتا تو بے جی مصنوعی غصہ بھر کر پیار بھرے لہجے میں چولہے کے قریب پڑا ہوا چمٹا اٹھا کر کہتیں۔

"ٹھہر جا! ابھی نکالتی ہوں تیری افسری۔" اور وہ لپک کر انہیں اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا۔ وہ دہائی دیتی رہ جاتیں اور وہ سارے صحن کا چکر لگا کر انہیں برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پوش پر بٹھا کر ہانپتے ہوئے کہتا۔

"اس کلو کو بیچ دیں بے جی! اس کا دودھ پی پی کر آپ کا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔"

بے جی محبت سے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیتیں۔ اور وہ دونوں بازو ان کی گردن میں ڈال کر کہتا۔

"بہت تھک گیا ہوں بے جی! سونا چاہتا ہوں۔"

گھر آنے پر وہ جی بھر کر سوتا اور اگر اٹھنے میں ذرا بھی دیر لگا دیتا تو بے جی پریشان ہو جاتیں اور زور زور سے آوازیں دینے لگتیں۔

"پاری پیاری۔ چل اٹھ میرے بچے! ذرا رونق لگے۔"

شب و روز کے ان ہی پیچ و خم کے درمیان وقت گزرتا چلا گیا۔ ایک دن زینب ننھی کلی کو ہاتھوں میں اٹھائے ماں کے در پر آن پڑی۔ خدائے مجازی دوست محمد کا فرمان تھا کہ "جاؤ بھائی سے جائیداد کا حصہ لے آؤ۔ ورنہ واپس نہ آنا!"

اور کس صبر و ہمت کے ساتھ بے جی نے اس قیامت کا بھی سامنا کیا تھا۔ دوست محمد خان جیسے بیوقوف کو اس بات کا قطعی احساس نہیں تھا کہ ابھی تو تایا محمد خان زندہ تھے۔ لہٰذا کسی بھی قسم کے بٹوارے کا فی الحال تو کوئی بھی امکان نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کمال منصفانہ طریقے سے جائیداد کے معاملات چلا رہے تھے۔ ان کا "ڈیرہ" ابھی آباد تھا۔ جس میں دوست محمد خان نے دن دہاڑے نقب لگانے کی کوشش کی تھی۔ زینب کے مقدر نے یاوری نہ کی۔ صلح کروانے کی تمام تر کوشش بے کار گئی۔ اور زینب ننھی کلی سمیت ماں کے در کی باسی بن گئی۔

کیپٹن شاہ پال کا دست شفقت بہن کے سر پر رہا۔ وہ محرومیوں کا ازالہ تو نہیں کر سکتا تھا لیکن پاری ماموں بن کر اس نے ننھی کلی کو اپنے دامن محبت میں پناہ دی اور اس کی ضروریات اور خواہشات کا احترام کرتے کرتے وہ اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان چلا آیا۔ اس کی پوسٹنگ نے بے جی پر کیا غضب ڈھایا تھا۔ آنسوؤں کا دریا تھمنے میں ہی نہ آ رہا تھا۔ حوصلہ ٹوٹ رہا تھا لیکن وہ خاموش تھیں۔ زینب انہیں تھام کر برآمدے تک لے آئی۔

شاہ پال نے کلی کو اٹھا کر سامنے صحن کے آخری کونے میں بندھی ہوئی بھینس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو کلی! آپ سب کے ساتھ ساتھ تو آج کلو بھی میری جدائی کے احساس سے رو رہی ہے۔"

زینب روتی ہوئی آنکھوں سے مسکرائی۔ اس نے بے جی کو تخت پوش پر بٹھایا۔ شاہ پال نے قریب بیٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"بنگال یہاں سے بہت دور ہے ناں؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں۔ بہت زیادہ دور نہیں ہے بے جی! صرف ایک دن کا سفر ہے۔ ہوائی جہاز سے تو صرف ڈھائی گھنٹے لگتے ہیں۔"

"وہ میرے وطن کا دوسرا حصہ ہے بے جی! میرے ہزاروں ساتھی وہاں اپنی ڈیوٹی پر ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"فکر کی بات تو ہے۔" تایا محمد خان اچانک بولے۔

"وہ خطہ زمین اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ وہ وقت میں ہم سے ایک گھنٹہ آگے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان ہزار، بارہ سو میل تک ہندوستان کا علاقہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب بنگالی مسلمان کی سوچ ہم سے الگ ہو چکی ہے۔" تایا محمد خان کا بیان کردہ یہ تلخ سچ بے حد کڑوا تھا کہ حاضرین اسے بڑی مشکل سے برداشت کر پائے۔ الوداعی ملاقات کے لیے آنے والے گاؤں کے نمبردار محمد اکبر خان نے کہا۔

"چل یہ باتیں چھوڑ دے محمد خان! قوموں کی زندگی میں ایسا اتار چڑھاؤ آتا ہی رہتا ہے۔ ہم ایک نبی کی امت ہیں۔

ہم کلمہ گو مسلمان ہیں۔ خطے الگ ہوئے تو کیا۔ وطن تو ایک ہے ناں۔ جہاد کے جذبے سے سرشار غازیوں کے لیے فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ چل اٹھ کر بچے کو اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کر۔ اس طرح کی باتیں کر کے اس کا حوصلہ نہ توڑ۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

بے جی نے آنسوؤں کے دھند میں اس کا سراپا جاتے ہوئے دیکھا، اور پھر جائے نماز بچھا کر اپنے رب کے حضور سربسجود ہو گئیں۔ تایا محمد خان گم صم بیٹھے رہے۔

وقت عصر جب مؤذن نے پکارا تو وہ مسجد کی سمت روانہ ہو گئے۔ لکڑیوں کے چولہے پر چائے کے لیے پانی رکھتے وقت جب زینب کی آنکھیں چھلک پڑیں تو کلی نے حیرت سے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امی! پاری ماموں کہاں چلے گئے؟"

زینب نے جواب دینا چاہا لیکن بول نہ سکی۔ بھیگی ہوئی آنکھوں سے بے جی نے کلی کی طرف دیکھا اور پھر رقت آمیز آواز میں پکارا۔

"یہاں آؤ میرے پاس۔" ننھے ننھے قدموں سے چلتی ہوئی کلی ان کے قریب سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہو گئی۔

"تمہارے پاری ماموں اس وطن کے دوسرے حصے میں چلے گئے ہیں، جسے بنگال کہتے ہیں۔ تم دعا کرو اللہ پاک ان کا محافظ ہو اور وہ جلدی واپس آ جائیں۔"

"اچھا میں دعا کرتی ہوں۔" اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھائے۔

"یا اللہ! میرے پاری ماموں بنگال سے مامی لے کر جلدی آ جائیں۔"

معصوم لبوں سے نکلے ہوئے دعا کی صورت میں ان لفظوں نے ماں بیٹی کے لبوں پر دکھی مسکراہٹ بکھیر دی۔

شام در آئی تو دل پھر سے بھر آیا۔ نگاہیں دروازے کی سمت دیکھتی رہیں، اور بے جی کا دل پکارتا رہا۔ "تم کب واپس آؤ گے شاہ پال! کب کس گھڑی اب تمہاری صورت میری نگاہوں کا نصیب بنے گی؟! ابھی تو جدائی کے یہ پہلے پہر ہیں، آنے والے لمحات میں بھی یہ دل قرار پائے گا یا یونہی تیری جدائی میں تڑپتا رہے گا؟ تو لوٹ آنا میرے بچے! بہت جلدی۔ میں تیرے لیے سراپا انتظار رہوں گی۔"

وہ سرِ شام ہی دروازے بند کر کے سونے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو گئیں۔ اور پی آئی اے کی ایک پرواز نے "باکمال لوگ اور لاجواب پرواز" کے سلوگن کے ساتھ کیپٹن شاہ پال کو پہلے کراچی اور بعد ازاں ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر پہنچا دیا۔

بہار کی ایک خوبصورت صبح اس کے قدموں نے بنگال کی سرزمین کو چھوا اور احساسات کے تمام در کھل گئے۔

پیارے قائد کا بنگال کتنا خوبصورت تھا۔ ہر طرف سبزہ، ہریالی، اونچے درختوں، گھنے جنگلوں اور بہتے دریاؤں کی سرزمین مشرقی پاکستان، معصوم چہروں والے غریب بنگالی عوام، محنت کی عظمت میں مگن، ہر سمت سکون کا احساس، اور اپنائیت کے دریچے، جن سے وفاؤں کی مہک آ رہی تھی، کچھ بھی تو اجنبی نہیں تھا، بالکل بھی نہیں، وہ سب تو اپنے تھے، بالکل اپنے، وہ اپنے ذہن سے تمام خدشات جھٹک کر چھاؤنی روانہ ہو گیا۔

ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کا پہلا دن بہت اچھا گزر گیا۔ فوج کی زندگی میں کوئی بھی کسی کے لیے اجنبی نہیں ہوتا، اجنبیت نہ تھی، البتہ جب شام شہر پر چھائی تو اداسی دل کے اندر در آئی، بنگال کی ہوائیں اک جدائی کا نوحہ سنانے لگیں اور یہاں سے دور بہت دور مغربی پاکستان کے علاقے پوٹھوہار میں بسنے والی بے جی، زینب اور کلی یاد آنے لگیں۔ دل نے جدائی کی اس شدت کو بہت محسوس کیا، لیکن حوصلے نے آگے بڑھ کر اس صبر کو وجود پر مسلط کر دیا، جو ایک فوجی جوان کا خاصہ ہوتا ہے۔

ابتدائی چار دن ذرا متضاد کیفیت میں گزرے۔ پھر چھاؤنی کے ماحول میں گھل مل کر سب ہی کچھ ٹھیک ہو گیا۔ البتہ پانچویں شب... میس کے ماہر باورچی کریم الدین کی تیار کردہ تیز مسالوں والی مچھلی "روہو" نے پیٹ کے اندر کی دنیا میں ایک قیامت برپا کر دی۔ بے جی کے ہاتھوں کی تیار کردہ مکئی کی روٹی، پراٹھے، ساگ اور کڑھی کھانے والے معدے نے اس نایاب نعمت کو قبول نہ کرتے ہوئے سب کچھ باہر اگل دیا اور "فوڈ پوائزننگ" کی یہ ایمرجنسی نافذ ہوتے ہی دوست احباب نے ان کے انکار کے باوجود انہیں ڈھاکہ سی ایم ایچ منتقل کر دیا۔

چونکہ میجر مصطفےٰ کمال کے بقول اتنا سیریس کیس سونف اور اجوائن کے قہوے سے قابو میں آنے والا قطعی نہیں تھا، اس کے لیے باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ صبح تک طبیعت اگرچہ سنبھل چکی تھی کہ اچانک بنگال کی سرسراتی ہوئی ہواؤں کے سنگ ایک مترنم آواز آئی۔

"جی... فرمائیے... کیا مسئلہ ہے؟"

کیپٹن شاہ پال نے آنکھیں کھولیں' اور پھر پلکیں جھپکنا بھول گئیں' وہ... بالکل سامنے کھڑی تھی۔ آج تک صرف خیالی شبیہہ کے باعث صرف دل و دماغ میں رہنے والی گھری سیاہ بڑی بڑی آنکھوں اور لمبے بالوں کی دراز چوٹی اپنی پشت پر لیے ہوئے' ڈاکٹر سنبل عرف بیاء مغربی پاکستان سے آنے والے کیپٹن شاہ پال سے پوچھ رہی تھی۔

وہ کوئی جواب نہ دے سکا' البتہ اس کا دل مسکرایا۔

"اب تو کوئی مسئلہ نہیں کہ آپ ایک مسیحا کے روپ میں مل گئیں' یہ معجزوں کا دور تو نہیں' کیا اب... اس زمانے میں بھی خواب' حقیقت بن سکتے ہیں۔ خیالی شبیہہ ایک زندگی کا روپ دھار کر سامنے آسکتی ہے۔ اخلاقیات اور حالات کی اجازت نہیں' کہ اک ذرا چھو کر یہ احساس کر سکوں کہ کہیں یہ محض خواب تو نہیں!"

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر ڈاکٹر بیاء نے اپنے قریب کھڑی نرس سے بنگالی میں کچھ کہا۔ اور پھر اس کے ہاتھ سے کاغذات لے کر دیکھنے لگی' اس نے کاغذات پر کچھ لکھا' ڈرپ بدلنے کی ہدایت کی' اور ایک مرتبہ پھر وہ کیپٹن شاہ پال سے انگریزی میں مخاطب ہوئی۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

دل کی صدا لبوں پر آگئی۔

"اب میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"اوکے۔" وہ اپنی پروفیشنل مسکراہٹ کے ساتھ مڑی' اور ٹک ٹک کی موسیقی بکھیرتے ہوئے جوتوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ عجیب قسم کا احساس ہر طرف بکھر گیا۔

یعنی خواب تو مغربی پاکستان میں دیکھے گئے' اور تعبیر یہاں مشرقی پاکستان میں نصیب ہوئی۔

"کمال ہے یار!" اس کے دل نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں تو اس "روہو" مچھلی کا شکر گزار ہونا چاہیے' جس نے جسم و جان میں تہلکہ برپا کرنے کے بعد تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا دیا۔"

بنگال کی سرزمین پر وہ دن نہایت بے چینی اور بے قراری کے ساتھ گزرا۔ سرشام احباب عیادت کرنے چلے آئے۔ میجر شمس یہ مژدہ لائے تھے کہ اسے بنگالی زبان کا کورس کرنے کے لیے نامزد کیا گیا ہے' تاکہ وہ ہیڈ کوارٹر میں ترجمان کے فرائض سرانجام دے سکے!

☆ ☆ ☆

وہ شب خوابوں میں گزر گئی' اور صبح اس حقیقت کو ڈاکٹر بیاء کے روپ میں دوبارہ سامنے لے آئی' وہ کہہ رہی تھی۔

"اب آپ ٹھیک ہیں' اور جا سکتے ہیں۔"

"کون کم بخت جانا چاہتا ہے۔" اس نے سوچا۔ "بڑی مدت کے بعد تو آپ سامنے آئیں' اور اب آپ ہمیں رخصت کر رہی ہیں' نہیں ڈاکٹر بیاء! یہ صریحاً "ناانصافی" ہے۔ ذرا دیر ٹھہر جائیے کہ ابھی تو آنکھوں کو ان خوابوں کی تعبیر ملی ہے' جو خواب زندگی ہیں' روشنی ہیں' اور مقصد حیات بھی!" لیکن... سارا فلسفہ' ساری باتیں دل کے اندر ہی رہ گئیں اور وہ اپنی ڈیوٹی سرانجام دے کر چلی گئی۔

لیکن... دل کی دنیا میں کیا ہوا؟

اک ہلچل مچ گئی' جذبات نے شوریدہ رخ اختیار کر لیا' اس دل کی بے چینی جب حد سے بڑھی تو انتہائی سکون اور اطمینان بخش نیند نے کسی انجانی سمت پرواز کی۔ اور کچھ جاگتی' کچھ سوتی ہوئی شب اک مقدر بن گئی۔

تب اس نے تہجد گزاری کو اپنا شعار بنا لیا کہ بلاشبہ اپنے رب کریم کی عبادت میں بہت سکون تھا۔ پھر وہ تسبیح ہاتھ میں آئی' جو بے جی مدینہ شریف سے لائی تھیں' اور وقت رخصت اس کے ہاتھ میں تھما کر انہوں نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

"نماز قضا نہ کرنا میرے بچے' اب اللہ وارث ہے۔"

بنگال کی فضا میں حسن بنگال نے کیپٹن شاہ پال کی زندگی پر وہ سحر طاری کر دیا' جس سحر کے زیر اثر انسانی زندگی یکسر تبدیل ہو جایا کرتی ہے۔ اور بڑی بڑی آنکھوں کے سحر نے کیپٹن شاہ پال کی زندگی بدل دی' ڈاکٹر بیاء سے دوسری ملاقات محض ایک اتفاق تھی۔ اسے اپنے سرکاری کاغذات مکمل کرنے کے لیے اپنی چند تصاویر کی ضرورت تھی' چنانچہ پریت روڈ پر واقع فوٹو اسٹوڈیو تک جانا ناگزیر تھا۔

اس شام بنگال کی ہواؤں میں قدرے تیزی تھی' اور آسمان دھرتی پر برس جانے کو بے تاب تھا' مختلف زاویوں سے اپنا چہرہ کیمرے کی آنکھ میں سمانے کے بعد جب وہ باہر آیا تو بارش کی بوچھاڑ سے بچنے کی کوشش میں مصروف ڈاکٹر بیاء بھی برآمدے میں آن رکی' اور وقت نے ان لمحوں پر یقین کی مہر ثبت کر دی' جن لمحوں میں اعتراف وفا کے بعد ایقان و یقین کی تاریخ رقم کی جاتی ہے۔

اور... یہ لمحات بھی تو ایسے ہی تھے! اک خاموشی اور سناٹے کی فضا میں رم جھم برستی بوندوں کے سنگ آنکھیں اک پیمان وفا کی داستان کہہ رہی تھیں' لب خاموش تھے' لیکن دل دھڑک کر اعلان کر رہا تھا کہ "یقیناً" تم ہی تو وہ منزل ہو' میرے یقین اور ایمان کی منزل۔ میرے اک حسین خواب کی تعبیر' اور میری زندگی کا وہ رخ' جس نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا' ہاں' وہ تم ہی تو ہو' ڈاکٹر بیاء صرف تم... ! دیکھو اس وطن کے دوسرے حصے میں واقع دور دراز علاقے کے اس اجنبی باسی کو اپنا سمجھ کر اپنی زندگی کی تمام وفائیں اسے بخش دینا۔

اسے مایوس نہ کرنا ڈاکٹر بیاء! کہ اب اس نے تمہارے حصول کے لیے کسی انسان سے التجا کرنے کے بجائے اپنے رب سے لو لگالی ہے۔"

اس شام ڈھاکہ کا آسمان برستا رہا' ڈاکٹر بیاء کی سیاہ دراز زلفوں سے شبنمی قطرے گرتے رہے' اس کے لب خاموش رہے' لیکن سیاہ آنکھیں بولتی رہیں۔

"مہر و وفا کے اس سفر میں فاصلے کچھ معنی نہیں رکھتے کیپٹن شاہ پال! ایقان و یقین کی سرحدیں کہیں دور نہیں' بلکہ زندگی کے آس پاس قریب... بہت ہی قریب ہوتی ہیں' اور پھر وہ جنہیں قدرت ملانا چاہے۔ وہ برسوں تک اک خیالی شبیہہ اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے۔ کسی ان دیکھے وجود کو سوچنے کے بعد ایسے ہی ملتے ہیں جیسے کہ ہم اور تم ملے کہ کل تک تو اجنبی تھے۔ لیکن آج قدرت نے شناسائی کے تمام در کھول دیے کہ شاید اسی در کے اندر ہماری مستقبل کی دنیا آباد ہے۔ آؤ کہ مل جل کر اس جہان کے اندر وفا' محبت' خلوص اور یگانگت کی ایک ایسی دنیا بسائیں۔ جس میں کوئی شکوہ' کوئی گلہ نہ ہو۔ ہر سمت خوشیاں پرواز کرتی ہوں اور مہر و وفا کی اس خوب صورت فضا میں ہم اور تم بہت سکون اور بہت اطمینان کے ساتھ جائیں!"

اس شام برستے آسمان نے اس اتفاقی ملاقات پر ایک ایسی تحریر کا آغاز کیا۔ جس کا لفظ لفظ خلوص' محبت اور خوشی کا پیام تھا۔

بہت تیز بارش کے باعث اب اس سائیکل رکشہ پر واپسی ممکن نہ تھی۔ جس سے اتر کر بھیگتی ہوئی ڈاکٹر بیاء اسٹوڈیو کے برآمدے میں آن رکی تھی۔ اور اب اس حلیے کے باعث تصویر اتروانا بھی ممکن نہ تھا۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

"آپ یہیں رکیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

اس نے اسٹوڈیو کے اندر جا کر گھر فون کیا اور اپنی امی جان سے پوچھا کہ کیا ان کا وہ فرزند ارجمند جسے وہ پیار سے اصل نام ممتاز کی بجائے مستی کہتی ہیں۔ ابو جی کی گاڑی لے کر گھر لوٹا ہے یا نہیں اور اگر لوٹ آیا ہے۔ تو اس سے درخواست کی جائے کہ برائے مہربانی وہ "مہران فوٹو اسٹوڈیو" تک آنے کی زحمت گوارا کرتے ہوئے اپنی بہن کے ساتھ اس مہمان کو بھی پک کرلے کہ جو مناسب سواری میسر نہ آنے کے باعث اس وقت واپس میس جانے سے قاصر ہے۔

شام کا دھندلکا گہرا ہو چکا تھا اور رات کا بڑھتا پھیلتا ہوا سماں بارش کے ساتھ ایک دھند کی کیفیت لیے ہوئے ڈھاکہ چھاؤنی پر چھا چکا تھا۔

"صاحب! آپ اندر آجائیے۔" بنگالی فوٹو گرافر نے باہر آکر کہا۔

"گاڑی آجائے تو چلے جائیے گا۔" اس سے پہلے کہ وہ اس مہربان پیشکش پر عمل درآمد کر سکتے۔ برستی ہوئی بارش میں چھینٹے اڑاتا ہوا مستی "مورس" کار ڈرائیو کرتے ہوئے برآمدے کے سامنے آن رکا۔

"تم بھی کمال کرتی ہو آپی!" وہ گاڑی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے چلایا۔

"بھلا کیا ضرورت تھی اس موسم میں گھر سے نکلنے کی۔ خوامخواہ مجھے مصیبت ڈالی۔ چلو آؤ جلدی کرو۔ مجھے دانیال کے ہاں ڈنر پر جانا ہے۔"

کیپٹن شاہ پال نے قدرے حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ نوجوانی سے جوانی کی منزل کی طرف پرواز کرتا ہوا۔ کرخت چہرے اور درشت لہجے والا یہ بنگالی سپوت' پاکستان کے مستقبل کا یہ معمار کہ قدرت جس کے ہاتھوں میں وقت کی تمام تر طنابیں تھما کر وطن کی تعمیر کا فریضہ سونپنے والی تھی۔ تمام تر اخلاقیات کو پس پشت ڈال کر ایک اجنبی کے سامنے کسی لہجے میں اپنی بڑی بہن سے مخاطب تھا۔ کیا اخلاقی قدریں اس امر کی اجازت دیتی ہیں کہ بلالحاظ اس طرح کی گفتگو کی جائے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

کیپٹن شاہ پال ٹوکنے کی پوزیشن میں تو نہیں تھا۔ لیکن اسے ممتاز قاضی عرف مستی کا یہ انداز بالکل نہ بھایا۔ رم جھم برستی ہوئی بارش کے پس منظر میں وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا! بس صرف پل بھری کی تو بات ہے۔ ڈاکٹر بیاء چلی جائے

گی اور میرے سامنے ایک مضطرب جہان ہو گا اور میری اپنی شورش زدہ ذات!

"آیئے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔" وہ چونک گیا۔ ڈاکٹر ثریاء کی آواز آکاش سے اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل تو بے تحاشا مچلا لیکن زبان نے اعلا ترین معاشرتی اقدار اور روایات کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ آپ زحمت نہ کریں۔ ذرا بارش تھم جائے تو میں چلا جاؤں گا۔"

"بنگال کی بارشیں جلدی نہیں تھمتیں۔" ڈاکٹر ثریاء کی آواز آئی۔ "یہاں کا آسمان اسی طرح بے تحاشا برستا ہی چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ دھرتی سیلابی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن ابر کرم کا غصہ کم نہیں ہوتا۔ آپ اگر انتظار کی زحمت اٹھائیں گے تو ممکن ہے شب یہیں تمام ہو جائے۔ تکلف نہ کیجیے۔ آیئے میرے ساتھ!"

اور...... وفاؤں کے سفر میں اس کے سنگ سنگ چلنے کا ارادہ کر لینے والا اس کا دل...... اس وقت دماغ کا یہ مشورہ قطعی طور پر قبول کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کہ اسے یہ پیشکش قبول نہیں کرنی چاہیے۔

اس کے قدم تو غیر ارادی طور پر ہی مورس کار کی طرف بڑھ گئے تھے۔ حالانکہ وہ شام کے دھندلکے میں بھی مستی کے چہرے کے بگڑتے ہوئے زاویے صاف نظر آرہے تھے۔ لیکن پھر بھی اس کے ہاتھوں نے آگے بڑھ کر اپنے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا تاکہ وہ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ سکے کہ یکدم آگے بڑھ کر ڈاکٹر ثریاء نے کہا۔

"آپ آگے بیٹھیں!"

یہ قابل احترام لہجہ دل کے اندر اتر گیا۔ لیکن کیپٹن شاہ پال نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ اک زبردست غصے کی کیفیت مستی پر طاری ہو گئی تھی۔ اسی کیفیت کے زیر اثر اس نے قدرے بلند آواز میں ڈاکٹر ثریاء سے پوچھا۔

"انہیں کہاں ڈراپ کرنا ہے؟"

"گھر ہی چلتے ہیں۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "ڈنر کے بعد میس چھوڑ آئیں گے۔"

"تو کیا...... میں رات بھر ڈرائیور بنا ڈیوٹی دیتا رہوں گا۔" مستی نے غصے سے جواب دیا۔ "میں نے تو خود دانیال کے گھر کھانے پر جانا ہے۔"

ڈاکٹر ثریاء نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہی یہاں تک کہ برستی ہوئی بارش کی زبردست بوچھاڑ میں گاڑی قمرالدین قاضی صاحب کے بنگلے کے پورچ میں جا رکی۔ کیپٹن شاہ پال نے ڈاکٹر ثریاء کے اصرار پر اترنا تو چاہا لیکن قدم جیسے جم کر رہ گئے۔

اگرچہ راستے میں ڈاکٹر ثریاء اور مستی کے درمیان تمام گفتگو بنگالی زبان میں ہوئی تھی۔ تاہم اس نے لب و لہجے سے تلخی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ معذرت کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اچانک کومل برآمدے میں آگئی۔

"اللہ آپی! آپ نے اتنی دیر کر دی۔ میں اور امی جان بے حد پریشان تھے۔ اب بھلا کیا ضرورت تھی۔ اتنے خراب موسم میں تصویر کھنچوانے کے لیے جانے کی۔ یہ کام کل بھی تو ہو سکتا تھا۔"

گاڑی سے نکلتے ہوئے شاہ پال کو دیکھ کر وہ یکدم چپ ہو گئی۔ اسے دیکھتے ہی شاہ پال کو محسوس ہوا۔ گویا کہ زینب باجی کی کلی ایک دم بڑی ہو کر سامنے آگئی ہو۔ وہی شوخی اور ویسا ہی شرارتی لب و لہجہ۔ ڈاکٹر ثریاء نے تعارف کروایا۔

امی جان بھی کسی قدر پریشانی کے عالم میں دروازے تک چلی آئی تھیں۔

جب اس گھر کے اندر پہلا قدم پڑا تو اجنبیت کسی دوسرے جہان کی طرف پرواز کر چکی تھی۔ یہاں تک کہ مناسب تعارف اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد معاشیات کے پروفیسر قمرالدین قاضی صاحب کہہ رہے تھے۔

"برخوردار! اگر مناسب سمجھیں تو لباس تبدیل کر لیں۔ بھیگے ہوئے کپڑوں میں ٹھنڈ لگ جانے کا احتمال ہے۔ ہم لباس مہیا کر سکتے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ سر!" اس نے نہایت ادب سے کہا۔

"میں بارش میں بھیگا نہیں۔ فقط معمولی بوچھاڑ نے میرا دامن بھگویا ہے۔"

پھر رات گئے تک...... وہ علاقہ پوٹھوہار کی ایک نواحی بستی سے تعلق رکھنے والا کیپٹن شاہ پال کیانی اس بنگالی گھرانے سے متعلق ہر فرد کے بے پناہ خلوص اور محبت کی بوچھاڑ سے بھیگ چکا تھا۔ ڈنر کے لیے جب ٹیبل لگی تو مستی نے نیچے آکر اپنی ماں کو مطلع کرنا ضروری سمجھا کہ وہ اپنے دوست دانیال کے ہاں ڈنر کے لیے جا رہا ہے۔ ماں نے ممتا بھرے لہجے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اتنے خراب موسم میں اس وقت گھر سے باہر جانا مناسب نہیں ہے

یہ امر کسی خطرے یا پھر حادثے کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنی فطری ضد میں آگیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے قمرالدین صاحب باہر آئے اور انہوں نے سختی سے حکم صادر فرمایا۔

"تم اس وقت کہیں نہیں جاؤ گے۔"

انہوں نے میز پر دھری ہوئی گاڑی کی چابی اٹھائی اور واپس ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ جہاں کومل کیپٹن شاہ پال کو بتا رہی تھی۔

"میں آج کل امتحان کے بعد بالکل فارغ ہوں اور گورنمنٹ لینگویج کالج میں شام کی کلاسز اٹینڈ کر رہی ہوں۔ میں فرور اسٹڈیز کے لیے انگلش لینگویج کا کورس کر رہی ہوں۔"

"او مائی گڈ لک۔" کیپٹن شاہ پال نے مسکرا کر کہا۔ "پھر تو ہم جلدی ہم مکتب کہلائیں گے۔ میں بھی بنگالی زبان سیکھنے کے لیے بہت جلد اسی ادارے میں داخلہ لینے والا ہوں۔"

"ویری گڈ۔" قمرالدین صاحب نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اپنے وطن کی ہر زبان پر عبور حاصل ہونا چاہیے!"

ان کی گفتگو جاری تھی کہ باہر ماں کے لاڈلے ممتاز عرف مستی کی مستی رنگ لائی۔ والد صاحب سے بے وقت باہر جانے کی اجازت نہ ملنے کے باعث وہ سمندری لہروں کی طرح شوریدہ سری کا نمونہ پیش کرتے ہوئے ہر اس چیز پر ٹوٹ پڑا۔ جو اس کی دسترس میں آگئی۔ چند نامناسب کلمات گویا آواز بلند باپ کے کانوں تک پہنچانے کے بعد اس نے دو چار شیشے کی بنی ہوئی چیزوں کو اپنی ضرب کاری سے کرچی کرچی کر دیا۔ اور پھر ماں کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک کر دھپ دھپ کی بے ڈھنگی آواز کے ساتھ زینے طے کرتے ہوئے اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نیچے ہر سمت خاموشی چھا گئی۔

میز پر کھانا لگانے کے بعد ڈاکٹر ثریاء انہیں بلانے آئی تو آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے قمرالدین صاحب خاموش بیٹھے تھے۔ البتہ سب شکوہ کناں تھے کہ قدرت نے اکلوتے بیٹے کی صورت میں ناخلف اولاد ان کے سر پر مسلط کر دی تھی۔ اور وہ آنے والے مزید بڑھاپے کے مایوس کن دور میں اس سبب سے آنے والی کسی بھی آزمائش سے خوفزدہ تھے۔ کومل نے مسکرا کر ماحول کو خوشگوار بنانے کی خاطر کہا۔

"آج تو امی جان نے مچھلی کا شوربہ اور چاول خود تیار کیے ہیں۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ سوچ ثابت ہوا کہ آج کے اس رزق میں آپ کا حصہ بھی شامل تھا۔"

"بات تو آپ نے ٹھیک کہی۔" کیپٹن شاہ پال نے کہا۔ "لیکن آپ کے ہاں پائی جانے والی اس مچھلی سے میرے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوئے۔ گزشتہ دنوں ہمارے میس کک کریم الدین کی تیار کردہ "روہو" نے مجھے آپ کی آپی کے حضور سی ایم ایچ پہنچا دیا تھا۔"

"پھر تو آپ کو اس "روہو" کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔" کومل نے برجستہ کہا پھر اس نے نہایت بے تکلفی سے سرگوشی کی۔

"میں صرف انگلش لینگویج اور بنگالی کے ساتھ اردو زبان ہی نہیں سمجھتی۔ بلکہ نگاہوں کی زبان بھی بخوبی پڑھ لیتی ہوں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں۔ کپتان صاحب! آپ کی آمد سے پہلے ہی اس گھر میں آپ کا ذکر خیر ہو چکا تھا!"

یہ لفظ تو گویا اس بات کی سند تھی کہ کیوپڈ کا تیر تو دوسری جانب بھی پہلی ہی نظر میں وار کر چکا تھا۔ جب ہی تو برستی ہوئی بارش میں اس گھر تک کا فاصلہ طے ہونا ممکن ہو سکا۔

"آپ بلا تکلف لیجیے۔" کومل نے ڈونگے کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ روہو نہیں مہاشیر ہے اور روہو کے مقابلے میں کہیں زیادہ بے ضرر۔ مگر ذرا احتیاط سے کھائیے گا کہ ہمارے ہاں کی مچھلی بے شک معصوم اور بے ضرر ہی سہی لیکن کانٹوں کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

اور...... پھر معصوم مہاشیر اس اجنبی مہمان کے لیے قطعی کسی تکلیف کا سبب نہ بنی۔ بلکہ اپنے اعلا ترین ذائقے کے باعث تسکین روح و قلب ثابت ہوئی۔ اگرچہ کھانے کی ٹیبل پر خوشگوار گفتگو نے ذرا دیر پہلے پیش آنے والی تلخی کا احساس کم کر دیا تھا۔ تاہم یہاں ان کی پریشانی صاف نظر آرہی تھیں۔ ڈھاکہ کی سول سوسائٹی میں اپنی ادبی حیثیت اور فنون لطیفہ سے خصوصی لگاؤ رکھنے والی شاہ زمانی بیگم مسز قمرالدین قاضی کی حیثیت سے ایک اعلا مقام رکھتی تھیں۔ وہ ٹیگور کی عقیدت مند تھیں اور ان کی شاعری میں ٹیگور کی شاعری کا اثر نمایاں تھا۔ وہ اکثر آزاد نظم

کہتیں۔ جس میں وطن سے وفاؤں کا سبق ملتا اور ذاتی زندگی میں بیٹے کے ناروا رویے سے دکھی یہ ماں اکثر سوچتی۔

"میں نے تو ہمیشہ وفا کا درس دیا۔ اچھائی کے ہر پہلو کی نشاندہی کی۔ تمہیں خلوص کی راہوں پر چلانا چاہا۔ مگر شاید میری تربیت میں کہیں کوئی کمی رہ گئی۔ ممتاز الدین قاضی کہ تم جوانی کی مستی میں آکر مستی بن گئے اور تم نے ادب و لحاظ کی تمام راہوں کو پامال کر دیا۔ ہم بحیثیت ماں باپ کے لحاظ ادب اور قدر کے قابل تھے۔ تم نے بدلحاظی میں آکر ہمیں ہمارے منصب سے ہی گرا دیا۔ اگر یہ آزمائش ہے تو پھر یہ آزمائش بہت سخت ہے۔ بہت طویل ہے اور اگر یہ ناخلفی ہے تو پھر قدرت تمہاری حامی اور ناصر ہو۔ میں تو ایک کمزور ماں ہوں اور ایک مجبور عورت تمہارے لیے دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی۔"

وہ..... بار بار مستی کے رویے کی معذرت کرتی رہیں۔ باہر بارش تھم چکی تھی۔ اگرچہ دل و من کے اندر آنسوؤں کی برسات جاری تھی کہ اوپر مستی کے کمرے سے آنے والی غصے بھری آوازیں ماں باپ کے دل پر بڑا ستم ڈھا رہی تھیں۔

بس فقط..... وقت کے اک ذرا سے فرق میں ہی وہ اجنبی مسافر ایک مکین بن چکا تھا۔

پروفیسر قمرالدین قاضی کے گھرانے کا ایک ایسا مکین جو یہ سب حالات جان کر بے حد آزردہ تھا اور جسے اس وقت اپنا ایک بھائی لالہ اصغر بے حد یاد آرہا تھا۔

تایا محمد خان کا بڑا بیٹا۔ چھ فٹ دو انچ قد کا مالک۔ لالہ اصغر جو صرف گاؤں بھر میں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے علاقوں میں بھی کبڈی کا بہترین کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ بازو پکڑنے اور وزن اٹھانے جیسے اہم ثقافتی تماشوں کا بادشاہ تھا اور بقول تمھے جس کی صرف ایک للکار پر بڑے بڑے شیر بکری بن جایا کرتے تھے۔ وہ لالہ اصغر اپنے باپ کے دربار میں بھیگی بلی بن جاتا۔ تایا جی اپنے مخصوص لہجے میں آواز لگاتے۔

"اوئے 'اصغرا'۔" اور وہ۔

"جی پایا جی!" کہتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے پیش ہو جاتے۔ باپ کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنا تو درکنار، نظریں اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکتے۔ "واہ" کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ والدین۔" اس نے سوچا۔ "جن کی اولاد تابعدار ہوتی ہے۔"

اور جس قدر دکھی تھے قمرالدین قاضی صاحب کہ اکلوتا بیٹا مستی کا نک نیم اختیار کرنے کے بعد اپنے دوست جوشی کے ہمراہ زندگی کی ان راہوں پر چل نکلا تھا جو کبھی بھی کسی شریف اور تعلیم یافتہ والدین کو قابل قبول نہیں ہوتیں۔ اس وقت وہ مجبور تھے۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ شاید کچھ بھی نہیں۔

وہ سب بہت تیز ہارن کی آواز پر چونک پڑے۔ جو بغیر کسی وقفے کے مسلسل بج رہا تھا۔ اس آواز پر ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر مستی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا اور ان سب کی طرف دیکھے بغیر مرکزی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ قاضی صاحب نے شاہ زمانی بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ ہی اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ ورنہ یہ شجاعت احمد عرف جوشی اپنے ساتھ اس کا بھی ستیاناس کرے گا۔"

ماحول میں خاصا تناؤ شامل ہو چکا تھا کہ کومل اپنا ستار اٹھا کر لے آئی۔ دیوان پر بیٹھ کر اس نے جب ستار کے تار چھیڑے تو موسیقی کی ان تانوں کے ساتھ ہی تلخی چھٹ گئی۔

کیا جادو تھا اس کی انگلیوں میں۔ کیپٹن شاہ پال مبہوت بیٹھا دیکھتا رہا۔ بہت سا وقت گزر گیا۔ تو ڈاکٹر بیاء کی آواز آئی۔

"آپ کافی شکر کے ساتھ لینا پسند کریں گے یا پھر.....؟"

اس سے آگے خاموشی تھی کہ شاید ہی نہیں بلکہ یقیناً" کیپٹن شاہ پال کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"اب تو اگر آپ زہر بھی دیں گی تو وہ امرت بن جائے گا۔ بغیر شکر کے کافی کا تو کہنا ہی کیا؟ او میرے خدایا! یہ آج میں کس جہان کی طرف آ نکلا ہوں۔ جہاں رنگ ہے۔ خوشبو ہے۔ زندگی ہے اور آرزوؤں کی وہ تمام تر تکمیل بھی۔ جہاں زندگی مکمل ہو جاتی ہے۔"

"ود آؤٹ شوگر۔" اس نے جواب دیا۔ سوچ لیجیے ڈاکٹر بیاء کی آواز آئی۔

"یہ بلیک کافی ہے۔"

اس نے کہنا چاہا۔ "آپ پھیکی کافی بھی پیش کریں گی تو وہ میری حیات میں شیرینی گھول دے گی۔" لیکن وہ اس بے تکلفی کی جرأت نہ کر سکا۔

رات گئے جب وہ اس گھر سے رخصت ہوا تو اجنبیت

اپنائیت میں بدل چکی تھی۔ قمرالدین صاحب کومل کے ہمراہ اسے میس تک چھوڑنے جا رہے تھے اور شاہ زمانی بیگم اسے دوبارہ آنے کی تاکید کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر بیاء کے لب خاموش تھے۔ لیکن آنکھیں واضح طور پر کہہ رہی تھیں۔

"ہم سے ملتے رہنا کہ اب حیات کا رخ بدل گیا۔"

میس کے راستے میں انہیں بہت تیزی سے اس جیپ نے اوورٹیک کیا۔ جس میں مستی اک سرور اور مستی کے عالم میں جوشی اور دیگر دوستوں کے ساتھ خدا جانے مستی کے کس جہان کی طرف رواں دواں تھا۔ بہت محتاط انداز میں گاڑی چلاتے ہوئے قمرالدین قاضی نے دکھی آواز میں کہا۔

"مسٹر شاہ پال! میں ایک ٹوٹا ہوا انسان ہوں۔" ان کا رقت آمیز لہجہ دل چیر گیا۔ ایک دم کیپٹن شاہ پال کا دایاں ہاتھ ان کے شانے پر ٹک گیا۔ اور اس نے بڑے وثوق اور نہایت یقین کے ساتھ کہا۔

"آپ فکر نہ کریں سر! میں ہوں ناں۔"

یقین کے اس کہے نے قاضی صاحب کی ذات کے اندر عزم و ہمت اور حوصلے کا اک شہر لا بسایا۔ وہ جو اپنے آپ کو اولاد کی سرکشی کے اس محاذ پر تنہا سمجھتے تھے۔ یکایک باحوصلہ ہو گئے۔ میس کے گیٹ پر گاڑی روک کر انہوں نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آتے رہنا۔ ہم منتظر رہیں گے۔"

"اوکے سر!" اس نے مسکرا کر کہا۔

"سی یو اگین۔" اس کا دل پریت کے ان راستوں کا مسافر ہو گیا اور شب عبادت کے ساتھ خوابوں میں گزرنے لگی۔

قدر دانی، عزت افزائی اور وفاؤں کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو زندگی میں ایک نئی جہت در آئی۔ کیپٹن شاہ پال گیلانی کو بنگال کی سرزمین پر ایک گھر مل گیا۔ ایک ایسا گھر جس میں محبت کی روشنی بھی زندگی اور خوب صورتی تھی۔

وہ بنگالی زبان سیکھنے کے لیے شام کی کلاسز میں جانے لگا۔ تو کومل سے ملاقات ایک معمول بن گئی۔ وہ نہایت محبت اور خلوص سے اسے بھائی صاحب کہہ کر پکارنے لگی۔ کمپاؤنڈ سے باہر آتے ہی وہ شرارت سے کہتی۔

"بھائی صاحب! آپی نے کہا تھا....." وہ جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دیتی۔

"کیا کہا تھا؟" وہ بے تابی سے پوچھتا۔

"وہ کہہ رہی تھیں، شام ڈھلے، جب پروا چلے تو مولسری تلے۔ تم آجانا۔"

اور وہ انکار نہ کر پاتا۔ قمرالدین قاضی کے بال سیاہ آنکھیں اس کی منتظر ہوتیں۔ اور گہری ہوتی ہوئی سیاہ شام پکارتی۔ "یہ وفاؤں کا سفر ہے۔ یہ آدرشوں کی منزل ہے۔ یہ سرزمین بنگال معتبر ہے۔ مقدس ہے۔ جہاں زندگی کو اک خواب کی تعبیر مل گئی۔"

بہت دنوں کے بعد اس نے بے جی کو اک طویل خط لکھا۔ جس میں تحریر تھا۔ "بے جی آپ کی گلو مجھے ایک حسین روپ میں..... یہاں اس خطے میں مل گئی ہے۔ ویسی ہی بڑی بڑی آنکھیں اور سیاہ دراز زلفیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کی گلو بہت زیادہ موٹی ہے اور یہ گلو۔ دبلی پتلی اور نازک ہے۔ آپ دعا کریں بے جی! بہت جلد آپ کو خوشخبری ملے گی۔"

نہایت واضح لفظوں میں تحریر کردہ اپنے دلی جذبات پر مبنی یہ تحریر جب علاقہ پوٹھوہار کے اس نواحی گاؤں میں بسنے والی بے جی کے کانوں تک پہنچی تو ان کا دل کھل اٹھا۔ انہیں تو شاہ پال کی خوشی ہر حال میں عزیز تھی۔ انہوں نے خط سنا اور فوری طور پر زینب کے ساتھ اس خوشی کو شیئر کرتے ہوئے صحن میں اک ہلکا پھلکا جشن منا ڈالا۔ گلی نے اسکول سے آتے ہی اس جشن میں اپنی خوشی کا مزید رنگ شامل کر دیا۔ لیکن غضب تو یہ ہوا کہ خط پڑھ کر سنانے والے منشی صاحب نے لگائی بجھائی جیسا اہم فریضہ سرانجام دیتے ہوئے فوراً "یہ داستان ڈیرے پر جا کر تایا محمد خان کے گوش گزار کر دی اور وہ جو کہ اپنی صغراں کے لیے نہ جانے کب سے امید لگائے بیٹھے تھے۔ چراغ پا ہو گئے۔ پہلی مرتبہ ان کے قدم غضب ناکی کے عالم میں بے جی کے گھر کی دہلیز پار کر گئے اور انہوں نے بغیر کسی رکھ رکھاؤ کے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

"یہ..... وہاں نوکری کرنے گیا ہے۔ یا پھر.....؟" خدا جانے وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ مگر کسی مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گئے۔ بے جی دیکھتی رہیں۔ مگر کچھ نہ بولیں۔ زینب چولہے کے پاس دبک گئی اور ننھی گلی سہم گئی۔

"یاد رکھنا تم سب۔" انہوں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "میں نے اس کی پرورش کی ہے۔ لہٰذا پہلا حق میرا بنتا ہے۔"

وہ مختصر لفظوں میں اپنا طویل مدعا بیان کرنے کے بعد دندناتے ہوئے باہر نکل گئے اپنے "ڈیرے" پر واپس پہنچ

کہ انہوں نے اصغر کو حکم دیا کہ وہ قریبی گاؤں سے مولوی انور شاہ کو بلا کر لائے۔

مولوی انور شاہ کا بڑا صاحبزادہ غلام رسول فوج میں لانس نائیک تھا اور ان دنوں وہ بھی اپنی ڈیوٹی پر ڈھاکہ میں موجود تھا۔ اصغر نے "فوراً" حکم کی تعمیل کی۔ لیکن شومئی قسمت کہ جب وہ مولوی انور شاہ کے گاؤں کی طرف رواں دواں تھے کہ راستے میں آنے والے ایک کھلے میدان میں ان کی نظر کبڈی کے ان دو ٹیموں پر پڑی جو اس وقت ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ والد گرامی کے تمام تر احکامات کو فراموش کرتے ہوئے وہ سائیکل ایک جانب کھڑی کر کے اس میدان کارزار میں کود پڑے۔ اور اپنے حلق سے مختلف آوازیں نکال کر مخالف ٹیم کو ہروانے اور اپنی من پسند ٹیم کو جتوانے میں اہم رول ادا کرنے لگے۔ یہاں تک کہ مخالف ٹیم کے ایک غصیلے ممبر کا مزاج اس دخل در معقولات کو برداشت نہ کر سکا۔ اور وہ اپنے ساتھیوں سمیت عزیزم "لالہ اصغر" پر حملہ آور ہو گیا۔

شام گہری ہوتے ہوتے اس "بلوے" کی نذر ہو گئی۔ اپنی اندرونی اور بیرونی چوٹوں کو سنبھالتے ہوئے جب وہ عشاء کے بعد مولوی انور شاہ کے گھر پہنچے۔ تو وہ نماز کے بعد وظائف میں مصروف تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس ملاقات کے ضمن میں معذرت کا پیام بھیجا۔ عزیزم لالہ اصغر جب اس مشن میں ناکامی کے بعد واپس گاؤں پہنچے تو تایا محمد خان نے پیرانہ سالی کے باوجود ڈیرے پر جمی ہوئی معززین کی نشست کی پروا کیے بغیر شہتوت کی چھڑی کے تابڑ توڑ حملوں سے ان کے دل و جان کو مزید گھائل کر دیا۔

اس طرح عزیزم کیپٹن شاہ پال کیانی کے ارسال کردہ خط کا سارا غصہ اپنے جگر پر اتارنے کے بعد وہ بڑے اطمینان کے ساتھ نیند کی وادیوں میں اتر گئے۔ دوسرے دن صبح سویرے انہوں نے اپنی گھوڑی پر کاٹھی ڈلوائی۔

بیچارے اس "نیلم پری" کو پچکارا اور بذات خود مولوی انور شاہ کے گھر پہنچ گئے۔ اس آمد کا مقصد یہ تھا کہ ڈھاکہ میں مقیم برخوردار غلام رسول کو اس بات کی مخبری کا حکم دیا جائے۔ جس کے باعث کیپٹن شاہ پال کیانی کی تمام جملہ سرگرمیوں پر نظر رکھی جا سکے اور انہیں مناسب اطلاعات بہم پہنچائی جائیں۔ بدلے میں وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھے۔

یہ...... اس زمانے کے بزرگوں کی وہ خاص نفسیات تھی۔ جس کے تحت اپنی پسند اور مرضی کے رشتے ناطے طے نہ ہونے کی صورت میں وہ کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی سے گریز نہیں کرتے تھے۔ تایا محمد خان نے جب اپنا مدعا بیان کیا۔ تو مولوی انور شاہ نے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"گھروں سے دور اور پھر ایک قسم کے پردیس میں بچے اکثر اس قسم کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ لیکن یہ عارضی کیفیت ہوتی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ جلدی سنبھل جائے گا۔ آپ اس کی زندگی کے ایک جذباتی پہلو کو اتنی سنجیدگی سے نہ لیں۔ چند دنوں کے بعد غلام رسول چھٹی پر آئے گا۔ تو پھر بات کریں گے۔"

تایا محمد خان مطمئن تو نہ ہوئے البتہ خاموش ہو گئے کہ ایک محاورے کے مطابق وہ تیل دیکھنے کے بعد اب اس کی دھار دیکھنا چاہتے تھے۔ اور پھر ہوا یہ کہ جب غلام رسول چھٹی پر آئے تو وہ اپنے ہمراہ کیپٹن شاہ پال کی جانب سے ارسال کردہ کئی سوغاتیں بھی لائے۔ مشرقی پاکستان کا خاص پھل اناس۔ کچھ پکے کیلے۔ اور پٹ سن سے تیار کردہ آرائشی اشیاء۔ جنہیں دیکھنے کے لیے سارا گاؤں امڈ آیا۔

تایا محمد خان کے دہن پر جب اناس کٹ کر اپنی نرم شیرینی سمیت رگ جاں میں اترا۔ تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور وہ عوام الناس پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے شاہ پال کی بے مثال تابعداری کے بعض قصوں کو بڑھ چڑھ کر سنانے لگے۔

رات عشاء کی نماز سے ذرا پہلے غلام رسول دوبارہ نہایت رازداری کے ساتھ بے جی کے گھر تشریف لائے اور انہوں نے اپنے "صاحب" کی تحریر کردہ تمام جزئیات ان کے گوش گزار کر دیں۔

بے جی کی خوشیوں کو تو تایا محمد خان سبوتاژ کر ہی چکے تھے۔ لہٰذا وہ قدرے تشویش کے ساتھ خط کے مندرجات سنتی رہیں۔ تاکید تھی کہ فی الحال سب ہی کچھ راز میں رکھا جائے۔ زینب نے البتہ اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔

"بھیا جاں نہیں گے۔ وہاں ہی ان کی شادی کی جائے گی۔ کوئی زبردستی نہیں ہے۔"

غلام رسول کی چھٹی ختم ہوئی۔ وہ واپسی کے لیے عازم مشرقی پاکستان ہوئے تو چھپ چھپا کر بے جی نے اپنی روایتی محبت اور ممتا کے اظہار کے لیے تحائف ان کے ہمراہ کر

دیے۔ شاہ زمانی بیگم کے لیے کشمیری شال ڈاکٹر سنبل عرف بیاء کے لیے ریشمی جوڑا اور کوہل کے لیے چوڑیاں۔ مغربی پاکستان کے باسیوں کی طرف سے ارسال کردہ یہ تحائف جب بنگال کی سرزمین پر مقیم قمر الدین قاضی کے اہل خانہ کو ملے۔ تو انہوں نے اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کیا اور بات بہت آگے بڑھ گئی۔

اب وہ سکون کے ساتھ ایک گھر کا تمنائی تھا۔ بنگال کی سرزمین پر ایک ایسا گھر جس میں ڈاکٹر بیاء کے سنگ زندگی کی تمام خوشیاں موجود ہوں۔ وہ بے جی کی طرف سے مکمل حمایت حاصل ہو جانے کے بعد بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہاں اس کا ضامن کوئی نہیں تھا۔

چنانچہ اس ضمن میں بذات خود بات کرنے کے لیے اس نے میجر سکین تاج اور جھرنا بھابھی کا سہارا لیا۔ جھرنا بھابھی ایک محب وطن خاتون تھیں۔ اور مغربی پاکستانی آفیسرز اور ان کی بیگمات کے حلقے میں اپنی نیک نامی خلوص اور ہمدردی کے باعث اچھی شہرت رکھتی تھیں۔ جبکہ میجر سکین تاج تمام برادر آفیسرز میں اپنی بے تکلف طبیعت کی وجہ سے بہترین انسان دوست سمجھے جاتے تھے۔ ڈھاکہ کی ایک زرد دوپہر میں اس نے اپنا یہ مسئلہ ان دونوں میاں بیوی کے سامنے رکھا۔ انہوں نے نہایت اپنائیت کے ساتھ ساری بات سنی۔

"میں...... یہاں ابھی تو نہیں سرا لیکن یہاں میرا کوئی ضامن بھی تو نہیں۔ جو میری طرف سے بات کر سکے!"

"بھائی آپ کیسی بات کر رہے ہیں!" جھرنا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہم جو موجود ہیں۔ ہم آپ کے ضامن بنیں گے۔ آپ یہ فرمایئے کہ کب قمر الدین صاحب سے بات کرنی ہے؟"

"کیوں سکین!" انہوں نے اپنے شوہر نامدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟"

"بالکل۔" میجر سکین تاج نے وثوق سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو برادر عزیز!" انہوں نے شاہ پال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"ہم ایک دوسرے کے محرم اور ضامن ہیں۔ تم ہمارے چھوٹے بھائی کی جگہ پر ہو۔ تمہاری جانب سے ہم بات کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ کسی قسم کی

پریشانی نہیں ہوگی۔"

"بہت بہت شکریہ سر!" اس نے ممنونیت کے احساس سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"بھابھی صاحبہ! میں آپ کا مشکور ہوں۔"

"کوئی بات نہیں بھائی! ہمارے لائق جو بھی خدمت ہو بلا تکلف بتائیے۔" مسز تمکین تاج نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ متحدہ پاکستان کا حسین ملاپ ہے اور ہمیں اس بات کی بہت خوشی ہے۔"

وہ اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کر کے واپس چلا آیا۔ جنہوں نے پریت کے ان راستوں پر کسی ظالم سماج کا کردار ادا کرنے کی بجائے اپنی چاہتوں کے پھول نچھاور کر دیے تھے!

زندگی چند قدم آگے بڑھی۔ اور منزل اب بے حد قریب تھی کہ سب ہی ہوائیں مخالف سمت چلنے لگیں۔ بنگال کی فضا میں ہمیشہ موجود رہنے والے سکون نے اک بے معنی ارتعاش کی صورت اختیار کر لی۔ پہلے پہل سرگوشیوں میں کی جانے والی گفتگو نے اب ان آوازوں کا روپ دھار لیا۔ جو محب الوطن پاکستانیوں کو کسی بھی صورت قابل قبول نہ تھی!

اور.... وہ جو وفاشناسی کی ایک عہد کی تکمیل کرتے ہوئے اب پریت کی آخری منزل پر تھا۔ اپنی زندگی کے اس انتہائی سنگ میل کے بالکل قریب تھا۔ اسے ہر طرف سے ٹوکا جانے لگا۔ میجر مصطفیٰ کمال تو گو لگی لپٹی بغیر صاف صاف کہہ دیتے کہ اسے اس بنگالی گھرانے سے راہ و رسم اس حد تک نہیں بڑھانے چاہئیں۔ جہاں سے واپسی ممکن ہی نہ ہو سکے اور آج اس کے مضطرب دل کی بے چینی اس لیے بڑھ گئی تھی کہ میس سے باہر آتے ہوئے کرنل حق نواز نے بطور خاص اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"برخوردار! ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں۔ اس کی کچھ حدود و قیود ہیں اور کسی حد تک شرعی حدیں بھی۔ گھروں سے دوری کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس خلا کو پر کرنے کے لیے غیر گھرانوں میں پناہ لی جائے۔

ہم وطن ہونا ایک الگ بات ہے اور غیریت اس کا دوسرا پہلو ہے۔ ہم ایک حساس ادارے سے وابستہ لوگ ہیں اور ہمیں اپنے فرائض منصبی کی نزاکت کا بخوبی احساس ہونا چاہیے مجھے امید ہے کہ تم ہمیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دو گے۔"

کمرے کی فضا میں سناٹا تھا اور ایک ایسی خاموشی بھی جس میں دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ دل جو اس وقت صوفی شاعر کے اس شعر کی تفسیر بنا ہوا تھا۔

"لا ربت محمد بخشا جگ وچ رہی کہانی"

وہ دل دھڑک رہا تھا۔

اور ہر دھڑکن میں ایک ہی صدا تھی۔ بیاء 'بیاء' بیاء!

تہجد کی ادائیگی سے فجر کی اذانوں تک یہی صدا سنائی دیتی رہی اب جبکہ پریت کی اس منزل پر وہ اپنی مہروفا کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنانے جا رہا تھا۔ کہ زندگی کے خوشیاں اس دائرے میں مقید کر لی جائیں تو ظالم سماج راستہ روک رہا تھا۔ اور یہ کیفیت اسے مضطرب کرنے کے لیے کافی تھی۔ تو گویا.... اب یہ بات سامنے آ چکی تھی کہ اس کا قمرالدین قاضی کے گھرانے سے راہ و رسم بڑھانا اور رات گئے ان کے گھر سے میس واپسی اور ڈاکٹر بیاء سے ملاقاتوں کے علاوہ لینگویج کلاسز میں کومل کے ساتھ بڑھتی ہوئی بے تکلفی سب ہی کچھ احباب کی نظروں میں آ چکا تھا۔

اور وہ سب بڑے ہونے کے ناطے حالات کے پیش نظر اسے ٹوکنا اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔ لیکن دل بے قرار تھا۔ کہ اس راہ پر چلتے چلتے آخری سنگ میل کے قریب پہنچ جانے کے باعث اب کسی بھی طرح واپسی پر آمادہ نہ تھا۔

آج کی شب نیند نے بہت دیر کے بعد آنکھوں میں بسیرا کیا۔ اور تھوڑی دیر کی مکانیت کے بعد کوچ کر گئی۔ کمرے کے باہر ہلکے قدموں سے اس کا بنگالی بیٹ مین رفیق اسلام آن رکا۔ اس نے اپنی انگشت شہادت کو دوہرا کر کے ٹک ٹک کی موسیقی بکھیری اور پھر اپنے مخصوص لہجے میں آواز دی۔

"صاحب ٹائم ہو گیا ہے۔"

اور یک دم اس کی بیداری عمل میں آ گئی۔ اور سوچ نے ایک مثبت رخ اختیار کر لیا کہ نہیں یہ باتیں تو فقط مفروضے ہیں۔ باہر کی دنیا میں تو سب ہی کچھ ٹھیک ہے درست ہے 'معاملات بخوبی چل رہے ہیں۔ کہیں کچھ بھی تو نہیں۔ کوئی خرابی نہیں شورش تو صرف دل کے اندر ہے۔ جو بلاوجہ مضطرب ہے۔ بیتے ہوئے لمحوں کی تلخ گھڑیاں تو صرف خواب ہیں۔

بنگال کا سنہری دیس تو آج بھی مہربان ہے۔ بے حد

مہربان اور پر یقین کہ قومیں کبھی اس طرح بھی بچھڑتی ہیں؟ ہم پر بزرگوں کی دعاؤں کا سایہ ہے۔ یہ شورش تو فقط چند شرپسندوں کی زندگی کا لائحہ عمل ہے اور یہ کبھی کامیاب نہیں ہو گا۔ کبھی نہیں!

اپنے دل کو تسلی دینے کے بعد اس نے آفس جانے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ آج گیارہ بجے کی پرواز سے میجر حسن امام اور میجر مصطفیٰ کمال کی بریگیڈیئر سراج کے ہمراہ لاہور روانگی تھی اور اسے بھی اپنے سینئرز کو الوداع کہنے کے لیے ایئرپورٹ جانا تھا۔

☆ ☆ ☆

دن کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ڈھاکہ شہر پر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی خنکی کا سماں تھا۔

ایئرپورٹ کی عمارت سنہری دھوپ میں چمک رہی تھی۔ کیپٹن شاہپال مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ کر اپنے سینئرز کی آمد کا منتظر تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد میجر حسن امام اور مصطفیٰ کمال بھی آن پہنچے۔

ان کے چہرے خوشی اور مسرت کے ان لمحات کے غمازی تھے جو اپنے پیاروں سے ملنے کی صورت میں پیش آنے والے تھے۔ چند منٹ کے بعد بریگیڈیئر سراج بھی تشریف لے آئے۔

رسمی طور پر سیلوٹ کا تبادلہ ہوا۔ وہ مسکرائے تو ضرور۔ لیکن ان کا قدرے تنا ہوا چہرہ ان کی اندرونی کیفیت کا آئینہ دار تھا جب ہی تو انہوں نے اپنے قریب کھڑے میجر تمکین تاج سے کہا۔

"اگر میرے صفائی میں دیے گئے دلائل قبول کر لیے گئے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں واپس آ کر کیا کرتا ہوں۔ تم دیکھ لینا۔"

میجر تمکین کچھ نہ کہہ سکے۔ انہوں نے شاہپال کی طرف دیکھا۔ جو سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ بنگالی زبان اب اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میجر تمکین تاج نے ہمت کر کے کہنا چاہا۔

"ایسا مت سوچیے سر! ایسا نہ کیجیے۔ ابھی تو خوشیوں کی شروعات ہے۔ ہماری تمہاری آرزوؤں کے سفر کی ابتدا ہے۔ یہ وطن اپنی جوانی کے عہد شباب پر ہے۔ اسے قتل کرنے کی نہیں بلکہ سنوارنے کے منصوبے بنائیے۔ جواں مرگی بہت دردناک سانحہ ہوتی ہے سر! اسے برداشت کرنا

بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسی سوچ ہمیں تباہی کی طرف لے جائے گی۔ پلیز سر! اپنی ان سوچوں کو وفاؤں کا رنگ دے دیجیے۔ تاکہ وقت اور زندگی ہماری اپنی رہے۔"

لیکن وہ خاموش رہے۔ لاؤنج کے شیشوں کے پار بالکل سامنے پی آئی اے کا جہاز اپنے سینے پر متحدہ پاکستان کی پہچان "پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز" کے الفاظ اپنے سینے پر سجائے ہوئے پر پھیلائے کھڑا تھا۔

مغربی پاکستان کے لیے یہ پرواز روانگی کے لیے تیار تھی۔ اور اب پرواز کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

"مسافروں سے درخواست ہے کہ جہاز پر تشریف لے چلیں۔" اچانک مصطفیٰ کمال کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ کرنل سلطان کیانی کے ہمراہ منزہ میر علی اندر آ رہی تھی۔

"او مائی گاڈ!" وہ بلند آواز میں بولا۔ "یہاں تو معجزوں پر معجزے رونما ہو رہے ہیں۔" حسن امام نے ایک دم اسی سمت دیکھا۔ ایئرپورٹ کے اندر تک بطور خاص اجازت لے کر آنے کے بعد کرنل سلطان کیانی ان کی طرف آ رہے تھے۔

تو گویا منزہ میر علی بھی اسی پرواز سے واپس مغربی پاکستان جا رہی تھی اور قدرت نے باکمال مہربانی یہ سفر بھی سنگ کر دیا تھا۔ یہ سب بالکل غیر متوقع طور پر پیش آیا تھا۔ لہٰذا اب دل کے اندر کی دنیا کسی حد تک بے ترتیب دھڑکنوں کے

ساتھ رواں تھی اور مسکراتے ہوئے لب گواہ تھے کہ ان بے ترتیب دھڑکنوں میں بھی خوشی کا عنصر کس قدر نمایاں تھا۔

لمحوں کی اس پرواز نے خاموشی کو بھی اک زبان عطا کر دی تھی۔ ایسی زبان جو بنا بولے بھی کہہ رہی تھی۔ جذبے سلامت رہیں۔ تمنا اگر نیک اور سچی ہو۔ تو وقت راستہ بدل بدل کر اسی طرح ایسے لمحات سامنے لے ہی آتا ہے۔ جن لمحات میں محبوب کا دیدار بھی عشق مجازی اور کبھی عشق حقیقی بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اس پرواز کا آغاز ہوا تو جہاز کے وسط میں درمیانی سیٹ پر تشریف فرما میجر مصطفیٰ کمال نے حسن امام سے کہا۔

"خاتون کی آمد دیر سے ہونے اور بورڈنگ کارڈ بھی تاخیر سے ملنے کے باعث کافی قسم کے دھکوں کا سامنا کر رہی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چاہیے کہ انسانیت کے ناطے انہیں اپنی نشست کی پیشکش کریں۔ میرا خیال ہے کہ تم ذرا تکلیف فرماتے ہوئے پیچھے چلے جاؤ اور انہیں اپنی نشست دے دو مہربانی ہوگی۔"

"تم یہ زحمت بذات خود کیوں گوارا نہیں کر لیتے۔" حسن امام نے کہا۔ "کیا ساری دنیا کے لیے انسانیت کا ٹھیکہ صرف میں نے ہی لے رکھا ہے۔"

"تو۔ چلو میں ہی یہ قربانی دے دیتا ہوں۔" مصطفیٰ نے جواب دیا۔

"دراصل تمہیں ویلفیئر کے کام کرنے کا شوق ہے تو میں نے سوچا کہ تمہیں آفر کروں۔ ورنہ احترام آدمیت اور انسانیت کے لیے تو میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔" وہ اس کی رائے سننے سے پہلے ہی اپنی نشست سے اٹھ کر عقبی نشستوں کی طرف چلے گئے۔ جہاں منزہ میر علی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ میجر مصطفیٰ کمال نے رسمی لفظوں میں انہیں اگلی نشست پر تشریف فرما ہونے کی دعوت دی۔ جسے پہلے تو اس نے "نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں" کہہ کر روایتی تکلف کا مظاہرہ کیا۔ لیکن بعد ازاں وہ مصطفیٰ کمال کے اصرار پر اٹھ کھڑی ہوئیں اور خاموشی سے حسن امام کی قریبی نشست پر بیٹھ گئی۔

"میں جا رہا ہوں۔" مصطفیٰ کمال نے حسن امام سے کہا۔

"اگر میری ضرورت ہوئی تو آواز دے لینا۔" اس نے شرارت سے ایک آنکھ بند کر کے کہا اور حسن امام نے بظاہر احتراماً منزہ میر علی کے لیے لیکن حقیقت میں مصطفیٰ کمال کے کان میں سرگوشی کرنے کے لیے کھڑے ہو کر کہا۔

"واہ۔ دوست ہو تو تم جیسا۔"

"ارے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "تم دیکھنا کہ میں لاہور پہنچ کر کیا کرتا ہوں۔"

"شکریہ۔" کہہ کر حسن امام نشست پر بیٹھ گئے اور مصطفیٰ کمال عقبی نشستوں کی طرف چلے گئے۔

گفتگو کا آغاز تو حسن امام نے ہی کیا تھا اور وہ بھی کسی قسم کی ذاتیات سے بالاتر ہو کر اس اہم مسئلے کے آغاز سے کہ مغربی پاکستان سے آنے والے معزز اراکین کے وفد کی عجلت میں واپسی اور صدیقی صاحب کے انتہائی سخت ریمارکس کے ضمن میں بریگیڈیئر سراج کی جی ایچ کیو طلبی کے سلسلے میں جس کے تحت ماحول اور حالت میں خاصی کشیدگی دیکھنے میں آئی تھی اور سیاسی و فوجی سطح پر یہ کوئی اچھی علامت نہ تھی۔ اس نے ساری بات بڑے غور اور انتہائی توجہ کے ساتھ سنی اور پھر اپنی رائے دیتے ہوئے مدھم آواز اور دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

"وطن عزیز میں اگر فوج اور سیاست دان اپنے اپنے راستے پر گامزن رہتے ہوئے اپنا اپنا کام الگ الگ سرانجام دیتے ہوئے رواں دواں رہتے تو بہت بہتر تھا۔ ہم نے تو یہ کیا کہ اقتدار کے شوق میں فوج کو سیاست میں گھسیٹ کر لیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ سیاست دانوں کی طرف سے محترم نادر محی الدین اور فوج کی طرف سے بریگیڈیئر سراج نے ہمارے وفد کو بریفنگ دیتے ہوئے صاف طور پر ایک تاریخ رکھنے کے باوجود جغرافیہ بدل جانے کی بات کھلے لفظوں میں کی۔ ڈھاکہ کے ڈی سی ہاؤس سے ہمیں رخصت کرتے ہوئے نادر محی الدین نے صاف لفظوں میں صدیقی صاحب سے کہا۔

"بہت ممکن ہے کہ آنے والے وقت میں آپ کو یہاں آنے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت پیش آئے۔"

نادر محی الدین تو سویلین تھے۔ سیاست دان تھے۔ ان کی بات تو سیاست کی ایک گپ سمجھ کر نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ فوج جیسے انتہائی بااعتماد اور وفادار ادارے سے تعلق رکھنے کے باوجود بریگیڈیئر سراج نے بھلا ایسا نقطۂ نظر کیوں پیش کیا؟

باقی آئندہ شمارے میں

مکمل ناول

70ء کی دہائی کے مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی اس کہانی کے کردار' وطن کی محبت اور رشتوں کی ڈور میں بندھے نظر آتے ہیں۔ میجر حسن امام تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ان کے والد مرتضیٰ امام نے سرکاری افسری میں بھی نیک نامی ہی کمائی۔ مشرقی پاکستان پوسٹنگ کے دوران ان کی نظر منزہ میر علی پر ٹھہرتی ہے اور وہ پہلی نظر میں ہی اس کی باوقار اور سلجھی شخصیت کا دیوانا ہو جاتا ہے۔

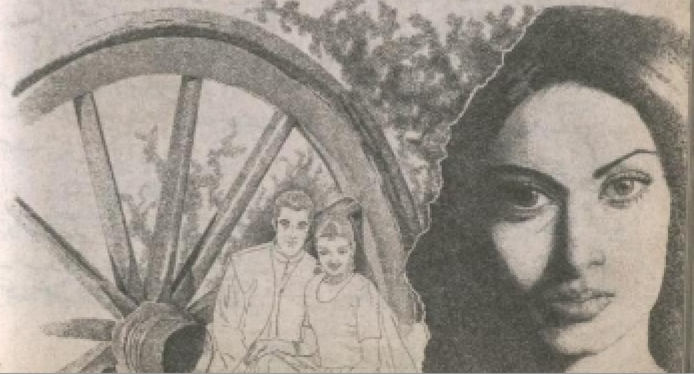
منزہ میر علی' رفیق صدیقی کی سربراہی میں وفد کے ساتھ دورے پر مشرقی پاکستان آئی ہے اور کرنل سلطان کیانی کی بھانجی ہے۔

پوٹھوہار سے تعلق رکھنے والے کیپٹن شاہ پال کو مشرقی پاکستان آتے ہوئے علم نہ تھا کہ یہاں پروفیسر قمر الدین قاضی کی صاحبزادی ڈاکٹر سنبل عرف بیاء کی کالی آنکھیں اپنا اسیر کر لیں گی۔ کیپٹن شاہ پال اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شاہ پال کی تربیت بے جی نے مضبوط پیمانے پر کی ہے۔ بچپن میں ماں باپ سے محرومی نے اسے بے حد حساس اور ذمہ دار بنا دیا ہے۔ تایا محمد خان نے اس کے سر پر سایا شفقت رکھا۔ وہ اپنی آباء کی پیروی کرتے ہوئے فوج میں کمیشن لیتا ہے۔

بڑی بہن کو کم عمری میں طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ اور ننھی کلی ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ شاہ پال بنگال ٹرانسفر سے گھر بھر میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ لیکن تایا محمد خان اور شاہ پال سب کو مطمئن کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر بیاء کے انتخاب پر زینب اور بے جی بے حد مسرور ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر بیاء کی چھوٹی بہن کومل' کیپٹن شاہ پال اور ڈاکٹر بیاء کے درمیان پل کا کام کرتی ہے جبلہ اکلوتے بھائی ممتاز قاضی عرف مستی کو گھر میں اس کی آمد و رفت قطعاً پسند نہیں ہے۔ شاہ پال اپنی طرف سے بات کرنے کے لیے اپنے سینئر افسر میجر سکین تاج اور جھرنا بھابھی سے درخواست کرتا ہے' وہ اسے اپنے مکمل تعاون کا یقین

سا جدہ حبیب

ودی وعدہ وفائیں



دلاتے ہیں۔
نادر محی الدین بد طینت گھاگ سیاست دان ہے جو وطن دشمن عناصر کے ساتھ مل کر ملک توڑنے کے منصوبے پر کام کر رہا ہے' اس سلسلے میں وہ بریگیڈیئر سراج کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ نادر محی الدین کی بہن نزہت باری ان ہی کی طرح متعصب ذہنیت رکھتی ہیں۔ انہیں اپنے لاڈلے اور ضدی بیٹے نوید باری کے لیے کرنل سلطان کی بیٹی شاہ پسند آجاتی ہے۔ کرنل کیانی کو بیگم نزہت کی ہٹ دھرمی ناگوار گزرتی ہے۔ تاہم نادر محی الدین اور بریگیڈیئر سراج کے داؤ میں کرنل سلطان کا گھرانہ اپنی سادہ لوحی کے باعث آجاتا ہے۔
بریگیڈیئر سراج کے شر انگیز بیان پر مغربی پاکستان سے آیا وفد بائیکاٹ کرتے ہوئے دورہ مختصر کرتا ہے۔ سینئر رکن رفیق صدیقی کی شکایت پر بریگیڈیئر سراج کی جی ایچ کیو میں طلبی ہو جاتی ہے۔ کھسیاہٹ میں وہ مغربی پاکستان سے آئے میجر حسن امام اور میجر مصطفیٰ کمال پر غصہ نکالتے ہیں۔ میجر حسن امام اور میجر مصطفیٰ کی بھی جی ایچ کیو حاضری ہوتی ہے۔ کرنل سلطان کیانی کی بیٹی کی شادی میں میجر حسن امام کی منزہ میر علی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے' اس کے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ سوئے اتفاق وہ بھی اس فلائٹ سے واپس مغربی پاکستان جا رہی ہے۔ جس سے میجر حسن اور میجر مصطفیٰ کی واپسی ہے۔ میجر مصطفیٰ کمال محبت کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے میجر حسن امام کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲ دوسری قسط

دو نفوس کے اس طرز عمل نے مغربی پاکستان کے ان حلقوں میں زبردست اُتھل پچادی ہے۔ جو جذبہ حب الوطنی سے سرشار اور ہر صورت میں اس پاک وطن کو متحد رکھنا چاہتے ہیں۔ "اگر ہم یہ سمجھیں سب کچھ ٹھیک ہے۔" "تو یقین کریں کہ یہ ہماری بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ایک ایسی غلطی جو تاریخ کا اک جرم بن جایا کرتی ہے۔"
وطن کا دکھ اور احساس ایک پل بن گیا اور اس پُل پر چل کر شناسائی کی کئی منزلیں طے ہو گئیں۔
اس نے پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ میں ماسٹرز کیا تھا اور ایک سرکاری پبلک ریلیشنگ ادارے سے وابستہ تھی۔
اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ حسن امام کو بتایا لیکن حسن امام کے دل کا پروگرام تو کچھ اور تھا۔
وہ اس کا حقیقت پسندی پر مبنی مزاج جان چکا تھا۔ لہٰذا روایتی طور پر اظہارِ عشق نہ کر سکا۔ حالانکہ دل نے بہت چاہا تھا۔
"بریگیڈیئر سراج سمیت ان کی قوم کا کوئی بھی فرد ہمارے لیے اجنبی نہیں لیکن بعض نادیدہ قوتیں اس خطے کا امن برباد کرنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ راولپنڈی سے ان کا بلاوا قدرے دیر سے آیا ہے۔ فوج سے متعلق ارباب اختیار کو تو بہت پہلے سے ان باتوں کا نوٹس لے لینا چاہیے تھا۔"
"میرا خیال ہے کہ!" حسن امام کے دل نے واضح اور فوری رائے دی۔ "اگر قسمت نے یاوری کی تو پھر میرے یار! یہ خاتون ایک مشکل بیوی ثابت ہوگی۔ تاریخ اور فلسفے پر اس کی گہری نظر ہے۔ اور یہ حالات کا بہترین ادراک بھی رکھتی ہے۔ محترمہ ایک باشعور 'اعلا تعلیم یافتہ اور عقل مند فرد ہیں۔ سوچ لو۔ کہیں مستقبل میں مروانہ دینا۔"
لیکن دل تو فیصلہ کر چکا تھا۔
پرواز کے لمحات تمام ہوئے اور مسافروں نے سکھ کا سانس لیا۔ زندگی میں مسافرت بھی عجب دکھ ہے۔ سفر تھکا تو دیتا ہے لیکن اپنوں سے ملا بھی دیتا ہے۔ ملاقات کا یہ وقت زندگی میں بڑی عجیب خوشی اور سرشاری بھر دیتا ہے۔
جہاز کے دروازے پر ذرا رک کر حسن امام نے منزہ میر علی کا دستی سامان تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ اب مجھے آپ کی طرف سے یہ بوجھ اٹھانے کی اجازت مل جائے گی۔"
وہ جواب میں کچھ نہ بولی اور اس نے مسکرا کر اپنا چھوٹا دستی بیگ اس کی جانب بڑھا دیا۔
"مبارک ہو۔" پیچھے آتے ہوئے مصطفیٰ کے لب خاموش نہ رہ سکے۔ "اب شاید تمہیں ہر قسم کا بوجھ اٹھانے کی اجازت مل جائے۔" حسن امام نے تنبیہی نظروں سے مصطفیٰ کمال کی طرف دیکھا تو اس نے دوبارہ جملہ کسا۔
"کیا ہے یار! ایک چھوٹا سا شکریہ تو ادا کر دے۔"
"تو کار روائی مکمل کروانے کا وعدہ پورا تو کر۔ پھر میں ایک ہی مرتبہ تیرا شکریہ ادا کروں گا۔" اس نے جواباً کہا۔
وہ تینوں ایک ساتھ لاؤنج سے باہر آئے تو ہجوم میں سے لخت جگر کو تلاشتی ہوئی ممتا کی نظریں سامنے آگئیں اور پھر کسی قدر حیرت کے لمحات اس ماحول پر چھا گئے کہ جب اس نے عارفہ اور عباس ماموں کے ساتھ آئی ہوئی اس سے دو سال چھوٹی بہن عقیلہ نے منزہ میر علی پر نظر پڑتے ہی حیرت کے ساتھ کہا۔
"ارے۔ منو کدھر؟" اور پھر لپک کر منزہ میر علی کے گلے لگ گئی۔ اپنی خوشی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے بتایا۔
"میں اور منو لاہور کالج فار وومن میں ایف۔ اے میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ یہ میری وہ کلاس فیلو ہے جسے میں آج تک نہیں بھولی۔"
"دوبارہ مبارک ہو یار!" مصطفیٰ کمال نے حسب عادت اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تم صدیقی صاحب کا احسان لینے سے بال بال بچ گئے۔"
مشرقی پاکستان کی اس پرواز سے آنے والے مسافر اب اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ یہ جمعۃ المبارک کا مقدس دن تھا۔ جس کی روشنی میں پاکیزہ رشتوں کا مقدس ملاپ سامنے آیا تھا۔ بریگیڈیئر سراج سڑک کے راستے اب عازم راولپنڈی ہو چکے تھے اور مصطفیٰ کمال نے تھوڑی ہی دیر پہلے گوجرانوالہ کی راہ لی تھی۔ ہفتہ اور اتوار کا دن اپنے پیاروں کے ساتھ گزارنے کے بعد پیر کی صبح اسے نئی۔ ایچ۔ کیو میں رپورٹ کرنا تھی۔
سرشام بہت ساری خوشیاں ماں اور بہنوں کے دل میں سمٹ آئیں۔ بات کہاں سے چلی اور پھر کہاں پہنچ گئی۔ حسن امام نے بغیر کسی تکلف کے اپنی دلی کیفیت گوش گزار کر دی۔
"آپ فکر نہ کریں بھیا۔" عقیلہ نے تسلی دی۔ "ممکن شاید واپسی پر یہ خاتون بطور بیگم آپ کے ہمراہ ہوں گی۔"
"اتنی جلدی۔" عارفہ نے یقین نہ کرتے ہوئے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔
"اور کیا؟" عائشہ نے بھی مسکرا کر گفتگو میں حصہ لیا۔ "بھئی فوجی افسر کو رشتہ دینے سے بھلا کون انکار کرے گا۔ فوج میں جانے کا سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ من پسند رشتہ ملنے میں آسانی رہتی ہے۔"
"کیا خیال ہے؟" اماں 'عقیلہ سے مخاطب ہوئیں۔
"پہلے صدیقی صاحب سے بات کر لی جائے؟"
"ویسے تو کوئی حرج نہیں۔" "وہ ہمارے بزرگ ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم عباس ماموں کی وساطت سے ان کے گھر تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ کہیں دور پار سے ماہی جان کی اس گھرانے سے رشتہ داری بنتی ہے۔"
"ہاں۔" عائشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان کی پھوپھی کے نانا کی بہن کی جو نواسی ہیں نا۔ وہ ماہی جان کی واقف کار ہے اور وہ بھی ہماری طرح اسے اپنی بھابی بنانے کا سوچ رہی ہیں" عائشہ کے اس تبصرے پر سب مسکرا دیے۔
"فضول باتیں نہ کیا کرو۔" اماں نے حسب عادت ٹوکا۔ تو وہ برا مان گئی۔
"یہ کوئی فضول بات نہیں اماں! دور پار کی رشتے داری ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔"
"میرا خیال ہے کہ صدیقی صاحب کو ساتھ لے جانا بہتر رہے گا۔" عارفہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔
"جی ہاں۔" عائشہ دوبارہ بولے بنا نہ رہ سکی۔ "تاکہ کام بننے سے پہلے ہی بگڑ جائے۔ کیا آپ لوگوں نے سنا نہیں کہ یہاں سے مشرقی پاکستان جانے والے وفد کی جذباتی فیصلے کی بنیاد پر واپسی نے بھائی لوگوں کو کس مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اب خدا جانے جی۔ ایچ۔ کیو میں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ نہیں جی۔ ہم تو بذات خود جا کر ان کی عدالت میں اپنا یہ مقدمہ پیش کریں گے۔ آگے اللہ کی مرضی۔"
"رہنے دو تم سب' میں خود عقیلہ اور بھائی کے ساتھ جاؤں گی۔" اماں نے آخری اور حتمی فیصلہ سنا دیا ہے۔
"چلو بیٹے۔ ذرا آرام کر لو۔" وہ حسن امام سے مخاطب ہوئیں۔ "سفر کر کے آئے ہو۔ تھک گئے ہوگے۔"
"تھکن کا تو سوال ہی نہیں۔" عائشہ نے پھر مسکرا کر کہا۔

"اماں ایمبیا جہاز پر آئے ہیں۔ کوئی پیدل تو نہیں۔ کیوں بھیا؟" وہ حسن امام سے مخاطب ہوئی۔

اس نے سوچا۔ کتنی خوش گوار ہوتی ہے ایک پرسکون گھر کی زندگی۔ جس میں ایک ماں ہوتی ہے۔ محبت کرنے والی بہنیں اور بھائی ہوتے ہیں۔ بے شمار آرزوئیں ہوتی ہیں۔ کئی پیار بھری فرمائشیں کہ وہ جب بھی چھٹی آئے۔ اماں کہتیں۔

"بیٹا! ذرا مجھے وردی تو پہن کر دکھا۔" وہ فوری طور پر تعمیل حکم کرتا۔ اماں کی آنکھیں اسے دیکھ کر نم ہو جاتیں۔ اس کا سلیوٹ اماں کی زندگی کے شب و روز بڑھاتا اور وہ دونوں ہاتھ عرش کی طرف اٹھا کر کہتیں۔

"بیٹے! اس وردی کا مان رکھنا۔ قسمت والوں کا نصیب بنتی ہے یہ وردی یہ غازیوں اور شہداء کا پہناوا ہے میرے بچے! اس سے وابستہ تمام وعدے اور وفائیں نبھانا۔ یہ وطن کا مان ہے۔ اس مان کو قائم رکھنا۔"

"بھیا۔" عائشہ کو جیسے ایک دم یاد آ گیا۔ "آج آپ وردی پہن کر کمانڈو صاحب کو سلیوٹ نہیں کریں گے؟" اس کا اشارہ اماں کی طرف تھا۔

"کیوں نہیں ضرور۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"آج نہیں کل۔" وہ بولیں۔ "میں تیرے ساتھ تصویر کھنچواؤں گی۔ میں نے عباس بھائی کو کہہ دیا ہے۔ وہ فوٹو گرافر کو لے آئیں گے۔"

"تصویریں تو اب اور بھی بہت سی کھنچیں گی۔" عائشہ مسکرائی۔ "بس ذرا امیر علی صاحب "ہاں" کہہ دیں تو....!"

"ان شاء اللہ۔" عقیلہ نے کہا۔ "ہم کل ہی ان کے ہاں جائیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ مشرقی پاکستان واپسی پر منزہ بھی بھیا کے ساتھ ہو۔"

"چل عائشہ! جا کر چائے لے آ۔" اماں نے اسے وہاں سے اٹھایا۔

"اماں۔" حسن امام ماں سے مخاطب ہوئے۔ "میری چھٹی بہت کم ہے۔ آپ کوشش کریں کہ..." اور اماں اس کا مدعا سمجھ گئیں۔

"آپ فکر نہ کریں بھیا۔" عائشہ نے کچن کی طرف جاتے ہوئے پلٹ کر کہا۔ "ہم کل ہی جا کر ان سے کہہ دیں گے کہ ہمارے وطن کے ایک پاسبان کو آپ کی دختر نیک اختر سے زبردست قسم کا "وہ" ہو گیا ہے۔ جو اکثر فلموں میں ہیرو کو ہیروئن سے ہو جایا کرتا ہے۔ آپ براہ مہربانی اپنی رضامندی سے ہمیں فوری طور پر آگاہ کریں۔ کیونکہ ہمارے ہیرو کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ ہیروئن کے پیچھے بھاگ بھاگ کر گانے گا سکے۔"

"تم تو صرف باتیں ہی کرتی رہو گی۔ کام کرنے سے تو رہیں۔" حسن امام نے کہا۔

"آپ مجھے چیلنج کر رہے ہیں۔ تو پھر دیکھیے۔ میں آپ کو راولپنڈی سے واپسی پر کتنی زبردست قسم کی خوش خبری سناتی ہوں۔"

وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے کچن کے اندر چلی گئی۔

"مصطفیٰ گھر پہنچ گیا ہو گا؟" اماں کو اچانک خیال آیا۔ پوچھ رہی تھیں۔

"وہ... تو شام تک پہنچے گا۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی تو وقت عصر ہے۔" اور پھر۔ وقت عصر بھی بیت گیا۔ اور شام گہری ہو گئی۔



وطن عزیز کی اس گہری ہوتی شام میں میجر مصطفیٰ کمال اپنے آبائی شہر گوجرانوالہ کی اس گلی میں داخل ہوا۔ جو سدا بہار بچپن، کبھی نہ بھولنے والے لڑکپن اور حسن جوانی کے انوکھے اور دل پذیر جذبات و احساسات کا امین تھی۔ سرخ اینٹوں کی اس زمین پر قدم رکھتے ہی یادوں کا اک جہاں سامنے چلا آیا۔ گلی کے آخری سرے پر ان کے آباؤ اجداد کا تعمیر کردہ چوبارہ نظروں کے سامنے تھا۔

جس کی نچلی بیٹھک میں والد گرامی درس و تدریس کا عظیم فریضہ سرانجام دیتے ہوئے فی سبیل اللہ ہر قسم کی خدمت میں مصروف رہتے۔ بیٹھک سے متصل کوٹھڑی میں طب و حکمت کی ایک چھوٹی سی دوکان قائم تھی۔ جو "دارالشفاء" کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اور اس طرح یہ بیٹھک اپنے اندر عام و خاص کے لیے دعاؤں اور شفاؤں کا مرکز رکھتے ہوئے "شاہ جی کی بیٹھک" کے نام سے جانی جاتی تھی۔

رات گئے تک اس بیٹھک میں مجلس لگی رہتی اور مٹی کے پیالوں میں ڈال گئی چائے کی خوشبو سے فضا مہکتی رہتی۔

اگرچہ آبائی پیشہ سپاہ گری تو نہ تھا کہ بزرگوں کی ایک نسل طب جیسے باوقار پیشے سے وابستہ رہی تھی۔ لیکن اس خاندان کے ایک ہونہار سپوت مصطفیٰ کمال نے فوج میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور کامیابی نے قدم چومے کہ شانوں پر چاند ستارے سج گئے۔

ہلکا اندھیرا چھا چکا تھا اور اب مزید گاہکوں کی آمد سے مایوس ہو کر فیقا پہلوان بچے ہوئے دودھ اور دہی کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہ اچانک میجر مصطفیٰ کمال اس کی دکان کے سامنے آن رکا۔

دکان کے اندر جلتے ہوئے بلب کی مٹیالی روشنی میں فیقے نے آنکھیں جھپک جھپک کر اسے پہچاننے کی کوشش کی اور جب پہچان مکمل طور پر ہوئی۔ "تو" "اوئے" کی ایک لمبی دھاڑ کے ساتھ وہ اس کی طرف اچھل کر بڑھا۔ یہاں تک کہ اپنی بے پایاں خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت تیزی اور عجلت میں زیب تن فرمائی گئی دھوتی کا آخری سرا دودھ کی کڑاہی میں الجھا اور کڑاہی سجدے میں جا گری۔ لیکن اس حادثے کی قطعی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے مصطفیٰ کمال کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر "اوئے ساڈا شیر آ گیا۔" کا نعرہ لگاتے ہوئے چیخ چیخ کر سارے محلے کو مطلع کرنا شروع کر دیا۔

اس کی بلند و بالا آوازوں سے سارا محلہ متوجہ ہو گیا۔ گھروں کے دروازے کھل گئے۔ چوباروں کی کھڑکیوں سے کئی آنکھوں نے جھانکا۔ پل بھر میں اس آمد نے اک میلے کا سماں پیدا کر دیا۔

اور تایا جی کی حویلی کی ڈیوڑھی سے جھانکتی ہوئی زارا نے اندر جا اطلاع دی۔

"زرقا باجی۔ کمال بھائی آ گئے۔"

پل بھر میں جلتے ہوئے چراغوں کی سی روشنی اس چہرے پر چھا گئی۔ یہ نام اس ذات سے منسوب تھا۔ جس نے صرف دل ہی دل میں اس ذات کو چاہا۔ اس نام کی پوجا کی۔ لیکن کبھی نہ تو دل کی بات زبان پر آ سکی۔ اور نہ ہی کبھی اظہار کی جرات ہوئی دل میں زبردست ہلچل مچی تو یادوں کے سنہری بکس کھل گئے۔ اور کئی ایک بیتے ہوئے لمحات کی تصویر سامنے آ گئی۔ ان دنوں مصطفیٰ کمال فوج میں کمیشن حاصل کرنے کی خاطر تیاری میں مصروف تھے۔

چوبارے سے ملحقہ بالکنی میں ان کا کتابوں پر جھکا ہوا گھنے سیاہ بالوں والا سر اکثر نظر آتا اور زارا شرارت سے کہتی۔

"باجی! سر تو نظر آ رہا ہے لیکن باقی بندہ کہاں ہے؟"

"میرے دل کے اندر۔" وہ کہنا تو چاہتی لیکن کہہ نہ پاتی۔ ایک دن زرقا کو شرارت سوجھی۔ اس نے زارا کے باکمال دماغ کے تمام تر وسیلے بروئے کار لاتے ہوئے ایک کاغذ پر لکھا۔

"بوجھ پہیلی۔ بوجھ پہیلی۔ وہ کون سا جانور ہے جو دن کو جنگلوں میں، شام کو لنگروں میں اور رات کو کمبلوں میں پایا جاتا ہے۔" پھر نیچے اس کا جواب لکھا۔ "فوجی۔"

اس انتہائی اہم نوعیت کے رقعے کو ایک بے ضرر قسم کے چکنے پتھر کے ساتھ لپیٹ کر ایک مضبوط دھاگے کے ساتھ باندھ کر اس سمت پھینکا گیا جہاں مستقبل کا یہ فوجی اپنی آئندہ زندگی میں کم از کم "شیر شاہ سوری" اور "نپولین بونا پارٹ" کے نقش قدم پر چلنے کا عزم لیے ہوئے تیاری میں مصروف تھا۔

پتھر نے ادھر ادھر الجھے بغیر اپنا سفر بخیر و خوبی طے کرتے ہوئے منزل پر پہنچ کر عین ان شانوں کے درمیان میں وار کیا۔ یہ وار انتہائی شدید قسم کا تھا۔ چکنے پتھر نے ٹکرانے میں کسی قسم کا تکلف روا نہ رکھا تھا اور درد کی کئی لہریں جسم و جاں کے اندر تک اتر گئی تھیں۔

اس اچانک وار سے نظریں اس سمت اٹھ گئیں۔ جہاں دو چہرے اس پیغام کے بخیر و خوبی پہنچ جانے کی کوشش میں کامیاب ہو جانے کے بعد خوشی سے کھلکھلا رہے تھے۔

اگرچہ درد کی لہریں ابھی مدھم نہ ہوئی تھیں تاہم "دشمن" کو فوری طور پر جواب دینا بے حد ضروری تھا۔ لہٰذا فوری عمل کے طور پر غصیلی نگاہوں سے چوبارے کی سمت دیکھتے ہوئے تحریر کیا گیا۔

"آج تو میں نے معاف کر دیا ہے لیکن... دوبارہ اس قسم کی بکواس کی گئی تو میں سر توڑ دوں گا۔"

جب یہ جواب اسی پتھر کی مدد سے "دشمن" کی جانب ارسال کرنے کی کوشش کی گئی تو دھاگہ بے وفائی کر گیا۔ اور بجلی کے ایک بوسیدہ تار سے بلاوجہ الجھ کر گلی میں سے گزرتے ہوئے "فیقے" کے سر پر جا لگا۔ اس آفت ناگہانی سے گھبرا کر فیقے نے اوپر کی سمت دیکھا۔ ہنستے مسکراتے دونوں چہرے غائب تھے اور مصطفیٰ کمال صاحب بڑے آرام سے مطالعے میں مصروف تھے۔

فیقا... کہ جگری یار تھا۔ رقعہ کھولتے ہوئے اونچی آواز میں پکارا۔ "پاجی۔ تھلے آؤ۔ میتوں دسوں۔ اے کی لکھیا اے۔" (بھائی صاحب نیچے آئیں۔ مجھے بتائیں۔ یہ کیا لکھا ہے۔) بہت تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے مصطفیٰ کمال نیچے گلی میں آئے اور رقعہ فیقے کے ہاتھ سے لے کر مٹھی میں دبا لیا۔ اب کی بار فیقے نے نہایت معصومیت کے ساتھ سوال کیا۔

"پاجی اے کی اے۔" (بھائی صاحب۔ یہ کیا ہے؟)

ایک سمت ہو کر مصطفیٰ کمال نے اپنی بند مٹھی کھولی اور بند رقعے کو کھول کر اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"یار فیقے! یہ تو کمال ہو گیا۔ اس رقعے میں لکھا ہے کہ فیقا اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو قسم ہے اللہ پاک کی میں زہر کھا لوں گی۔"

"اچھا۔" فیقہ حیرت سے بولا۔

"یہ کس نے لکھا ہے؟"

"ظاہر ہے کسی لڑکی نے ہی لکھا ہے۔ کوئی لڑکا تو اس قسم کی بات لکھ ہی نہیں سکتا!" مصطفیٰ کمال نے معصومیت سے کہا۔

"میرا خیال ہے۔" فیقے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ جو ہماری ماسی مراں ہے ناں۔ اس کی بیٹی جنتے نے لکھا ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے۔" مصطفیٰ کمال نے لاپروائی سے کہا۔

"مگر... وہ تو جٹی ان پڑھ ہے۔" فیقے کو اچانک خیال آیا۔ "وہ کس طرح لکھ سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی سے لکھوایا ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"سچ بات بتائیں پاجی۔" فیقے نے راز داری سے پوچھا۔ "کہیں یہ رقعہ اس نے آپ ہی سے تو نہیں لکھوایا۔" فیقے نے آہستگی سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

اب اپنی آفت گلے پڑتی دیکھ کر مصطفیٰ کمال نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"یار فیقے! اس قسم کی باتیں یہاں کھڑے ہو کر نہیں کی جا سکتیں۔ تم کسی وقت چوبارے پر آنا۔ میں تمہیں سمجھاؤں گا۔"

"اچھا پاجی۔" فیقے نے مطمئن ہو کر کہا۔ "میرا خیال رکھنا۔"

"ضرور۔" مصطفیٰ کمال نے یقین دہانی کروائی اور فیقا سرشاری کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔

اس کے بعد سے مصطفیٰ کمال نے اپنی لاڈلی دادے پوتری یعنی زارا کا نام "ڈاک" رکھ دیا۔

کامیابی کی تمام تر منازل بفضل تعالیٰ طے کر لینے کے بعد جب پی۔ ایم۔ اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی) کے لیے اس کی روانگی ہوئی تو زارا نے کہا۔

"ان شاء اللہ بھائی جان! آپ مستقبل میں بہت اچھے فوجی ثابت ہوں گے۔"

"وہ کس طرح؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ اس طرح کہ آپ نے تو فوج میں جانے سے پہلے ہی "سر، سر" کی گردان شروع کرنے کے علاوہ دوسروں کا سر توڑنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں۔"

"زارا۔" اس نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا۔ "تم مجھے خط لکھو گی؟"

"ضرور بھائی جان۔" زارا نے جواب دیا۔ "میں ڈاک جو ہوں۔"

اور پھر خوشی، محبت اور دعاؤں کے ساتھ اپنی اس منزل کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ جس منزل نے اسے ایک نہایت معتبر اور باوقار باعزت زندگی عطا فرمائی تھی۔ آج سب ہی کو اس پر فخر اور مان تھا۔

رات گئے تک شاہ جی کی بیٹھک میں محفل جمی رہی۔ مغربی پاکستان کے اس چھوٹے شہر گوجرانوالہ کے شہری اپنے ہی دیس کے دوسرے خطے بنگال کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ یہ ان کی محبت کا اظہار تھا۔ جس میں کوئی کھوکھلا پن نہ تھا۔ بلکہ وفاؤں کے گیت تھے۔ ایسے گیت جو اکثر دیہاتی مائیں اپنے بچوں کو ایک لوری کی صورت میں سناتے ہوئے یہ سبق دیتی تھیں کہ "اگر لام پہ (جنگ میں) دشمن سے آمنا سامنا ہو جائے تو میدان چھوڑ کر بھاگنا نہیں بلکہ نہایت دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے سینے پر گولیاں کھانا۔ پیٹھ پر نہیں۔ ورنہ میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔"

"پاجی! کیا وہاں پہلوان بھی ہوتے ہیں۔" فیقے نے نہایت معصومیت سے سوال کیا۔ تو مجلس میں دبی دبی ہنسی کی لہریں بکھر گئیں...!

"پہلوان تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ البتہ وہ لوگ فٹ بال نہایت شوق سے کھیلتے ہیں اور دنیا بھر میں فٹ بال کے بہترین کھلاڑی مانے جاتے ہیں۔" مصطفیٰ کمال نے جواب دیا۔

"اچھا یہ تو ٹھیک ہے۔" فیقے نے کہا۔ "آپ یہ بتائیں کہ کیا ان کی بھینسیں بھی سفید رنگ کا دودھ دیتی ہیں؟"

اس سوال پر اہل مجلس اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

"قدرت نے اپنے اصول و ضوابط ہر علاقے پر یکساں طور پر نافذ کر رکھے ہیں۔" شاہ جی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو فیقے! بھینسیں چاہے یہاں کی ہوں۔ یا پھر وہاں کی۔ دودھ کا رنگ سفید اور انسانی لہو کا رنگ سرخ ہی رہے گا۔ حالات اور ماحول بدل سکتے ہیں۔ لیکن اصول فطرت کبھی نہیں بدل سکتے۔"

اگرچہ فکر و دانش پر مبنی یہ ساری باتیں فیقے کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ تاہم وہ اپنا ڈھائی من وزنی سر کچھ اس طرح سے ہلا کر یہ تاثر دیتا رہا کہ گویا وہ سب ہی کچھ سمجھتا ہے۔

شب کا پہلا پہر بیت چکا تو یہ محفل برخاست ہو گئی۔ مصطفیٰ کمال اوپر چوبارے پر چلا آیا۔ سامنے آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ اور اس کی روشنی میں نیچے بستا ہوا سارا شہر سو رہا تھا۔ ہر طرف سکون اور اطمینان تھا اور اس سکون و اطمینان کی فضا میں سوئی ہوئی زندگی بہت گہری نیند میں تھی۔

نہ جانے کیوں...؟ بہت دیر تک مصطفیٰ کمال کو نیند نہ آئی۔ زینے پر قدموں کی ہلکی چاپ ابھری اور پھر یہ آواز مصطفیٰ کمال کے سرہانے آن رکی۔ مدھم تاریکی میں ایک نورانی سایہ پلنگ کے قریب آن رکا۔

یہ سید برکت حسین شاہ تھے۔ اپنی زندگی کے اکلوتے اور واحد وارث مصطفیٰ کمال کے والد بزرگوار۔ شریک حیات نے عین عالم شباب میں انہیں اپنی نشانی بخش کر الوداع کہا تو پھر وہ دوبارہ زندگی کی خوشیوں کی طرف رجوع نہ کر سکے۔ عرصہ دراز تک اک یاسیت اور مایوسی کے عالم میں جینے کے بعد انہوں نے اپنے رب سے لو لگالی۔ اور طب کے ذریعے خدمت خلق میں مصروف ہو گئے۔ اپنا آرام، اپنی زندگی سب کچھ انسانیت کے لیے وقف کر دیا۔

دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں وہ صرف چار گھنٹے سوتے تھے۔ باقی تمام وقت عبادت اور خدمت کے لیے مختص تھا۔

مصطفیٰ کمال دم سادھے لیٹا رہا۔ اباجی اس کے سرہانے کھڑے مختلف آیات پڑھ کر اس پر دم کر رہے تھے۔ "جاگ رہے ہو پتر؟"

"جی نیند نہیں آ رہی اباجی!"

"تو پھر چل مرشد کے حجرے پر چلتے ہیں۔" حکم ملا

"جی بہت اچھا۔" فوراً تعمیل کی گئی۔

محلے کی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ شہر سے دور ایک قدرے ویران مقام پر پہنچ کر رک گئے۔ ذرا فاصلے پر بنی مرشد کی جھگی میں ٹمٹماتے ہوئے دیے کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اباجی نے جھگی کے کواڑ پر اپنی انگشت شہادت کا رباؤ ڈالا۔

"آجاؤ۔" اجازت مرحمت فرما دی گئی۔

دونوں باپ بیٹا اندر داخل ہو گئے "نورانی سراپا مسکرایا اور مصطفیٰ کمال کی پشت پر تھپکی دی۔ شاہ جی سے مصافحہ کیا اور وہ باادب ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

خدا جانے وہ کون تھے کہاں سے آئے تھے لیکن برسوں سے یہیں مقیم تھے۔

مرشد نے نظریں اٹھائیں اور ان کی جلالی نظریں اس کے بدن کے آرپار ہو گئیں۔

"ہم نے دعاؤں میں ہمیشہ آپ کو یاد کیا۔ مٹی کے اس رنگ کا پیراہن آپ کا مقدر ہے اور اس مٹی کی حفاظت آپ کا فرض۔ آپ پاسبان ہیں اور عزتوں کے رکھوالے آپ کی قدر کی جانی چاہیے۔"

"مہربانی مرشد صاحب!" مصطفیٰ کمال نے نہایت نیاز مندی کے ساتھ کہا۔

"آپ دعا کیجیے اللہ پاک ہمارے وطن کا اتحاد سلامت رکھے مشرقی حصے میں مخالفت کی ہوا چل پڑی ہے۔" مرشد گہری سوچ میں ڈوب گئے "پھر یکایک چونکتے ہوئے گویا ہوئے۔

"تبدیلی تو قانون قدرت ہے مگر تبدیلی مثبت ہو خیر اور حق ہو تو ثمر ہے۔ سنہرے دیس بنگال میں سرخ آندھیوں کی آمد ہے ہماری تمام تر دعائیں اور دعوے فضا کے دوپ میں نظر آ رہے ہیں۔"

"بچاؤ کس طرح ممکن ہے؟"

"جو ناراض ہیں انہیں راضی کر لیا جائے "بھائی اور دشمن کا فرق واضح کر دیا جائے ورنہ ـــ" وہ کچھ کہتے کہتے۔

"ورنہ کیا ہو گا مرشد؟"

لال آندھیاں سروں پر تپتی ہوئی چھتیں اکھاڑ دیں گی' کئی وجود لہو رنگ ہو جائیں گے اور کئی پابند سلاسل۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" شاہ جی نے پھر سوال کیا۔

"آنے والے وقت کے لیے منصوبہ بندی 'عمل اس وقت کی اہم ضرورت ہے ہم دعا کریں گے۔"

مرشد آنکھیں بند کر کے گہرے مراقبہ میں چلے گئے 'وہ جھگی سے باہر نکلے تو صبح کی ہوا نے فضا میں ٹھنڈک کا احساس دلایا تھا۔



مصطفیٰ کمال کی آمد کی اطلاع ملتے ہی گجرات سے بڑی پھوپھو 'بی بی جان اپنی بیٹی بشریٰ کے ہمراہ تشریف لے آئیں۔ گھر بھر میں خوشی کا ایک اور رنگ اتر آیا۔

صحن کے اندر سرخ اینٹوں کے فرش کو ماہی مہراں اپنی بیٹی جنتے کے ہمراہ رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ اور اندر باورچی خانے میں زرقا اور زارا زبردست قسم کا ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ بالکل سامنے شاہ جی کی بیٹھک اور اوپری چوبارہ خاموش تھا کہ شعور و آگہی کے رت جگے کے بعد اب آرام فرمایا جا رہا تھا۔

پھل اور مٹھائی کی سوغات سنبھالتے ہوئے شوخ و چنچل بشریٰ باورچی خانے کے دروازے پر آن رکی۔

"وہ آ گئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" زرقا کے بجائے زارا نے جواب دیا۔

"اچھا۔ "وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ "کیسے ہیں وہ؟"

"بہت خوب صورت۔" زارا نے کہا۔ "بنگال کی مچھلی کھا کھا کر ان کا منہ بھی مچھلی کی طرح ہو گیا ہے۔"

"واہ زبردست۔" اس نے قہقہوں کی بوچھاڑ میں دوسرا سوال کیا۔ "ہمارے لیے کیا لائے ہیں؟"

"ڈھاکہ کی ململ کے دوپٹے۔ زرقا باجی کے لیے ساڑھیاں لاکھ سے بنے ہوئے زیورات اور بہت کچھ۔"

زارا کی طرف سے جواب آیا۔

"اچھا۔ "بشریٰ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"کہاں ہے یہ سب کچھ؟"

"خوابوں اور خیالوں میں۔" زارا نے کہا۔ "بشریٰ باجی! فی الحال تو ہمیں کچھ بھی نہیں ملا اب آپ آ گئی ہیں۔ تو شاید ہمارے بھی نصیب کھل جائیں۔"

"شاید؟" بشریٰ نے بے چینی کی کیفیت میں کہا۔

"ویسے "وہ" اس وقت کہاں ہیں؟"

"سو رہے ہیں۔" زارا کی طرف سے یہ اطلاع بم پہنچانے پر وہ چیخ پڑی۔

"اس وقت تک؟ وطن کے پاسبان سو رہے ہیں۔ یا خدا ہمارا کیا بنے گا؟ رات بھر کیا کوئی چلہ کاٹتے رہے ہیں؟"

"وہ بے شک لاکھ چلے کاٹتے رہیں بشریٰ باجی ہمارے ابا جی تو اگلے چاہ گن سے پہلے کی تاریخ نہیں دیں گے۔" زارا نے کہا۔

"بھئی۔ یہ تو زیادتی ہے۔" بشریٰ نے اپنی رائے دی۔

"موصوف اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ناکام و نامراد لوٹ چکے ہیں۔ اس مرتبہ تو میں خود ان کے لیے سفارش کروں گی۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" زارا نے جواب میں کہا۔

"اس مرتبہ تو مجھے شک ہے کہ جذبہ حب الوطنی سے مالا مال قوم کا یہ ہونہار سپوت بذات خود بیان دے گا کہ "ملکی حالات خراب ہونے کی بنا پر میں فی الحال یہ شادی نہیں کر سکتا۔"

"اور اگر کہیں انہوں نے ملکی حالات خراب ہونے کی بنا پر یہاں "یہ "شادی کرنے کے بجائے وہاں "وہ "شادی کر لی تو پھر کیا ہو گا؟"

"پھر وہی ہو گا۔ جو منظور خدا ہو گا۔" زارا نے اطمینان سے کہا۔

بشریٰ اور زارا ناشتے کا وہ خوان سجانے میں مصروف ہو گئیں۔ جو بطور خاص تایا جی کی ہدایت پر سیڑھیوں کا سفر طے کرنے کے بعد چوبارے تک جانے والا تھا۔ زرقا کسی کام سے اوپری منزل تک گئی ہوئی تھی۔ باورچی خانے میں واپس آئی تو بی بی جان بے تابی سے کہہ رہی تھیں۔

"کوئی تو جا کر اسے جگائے۔ بارہ بج رہے ہیں۔"

"وہ جاگ گئے ہیں۔" شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ زرقا نے کہا تو ایک دم بشریٰ نے پلٹ کر پوچھا۔

"باجی! آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"ان کا سفید اور گلابی لکیروں والا تولیہ باہر تار پر پڑا ہے۔"

زرقا نے مکمل طور پر سیاق و سباق کے حوالے سے اطلاع دی۔

"لو ہئے۔ میں صدقے جاواں۔" بشریٰ نے حسب عادت اونچی آواز میں کہا۔ "کیا شاندار قسم کا انداز پیغام رسانی ہے۔ واہ بھئی واہ۔ جواب نہیں اس زمانے کے عاشقوں کا بھی۔ اپنی آمد اور سونے جاگنے کی اطلاع پہنچانے کے کیا کیا طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔"

"یہ طریقہ تو بہت پرانا ہے۔" زارا نے انکشاف کیا۔ "کمال بھائی جب پی۔ ایم۔ اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی) میں تھے ناں۔ تو چھٹی پر آتے ہوئے اکثر رات گئے ان کی آمد ہوتی اور صبح سویرے چوبارے کی بالکنی میں بندھی رسی پر ہوا کے رخ پر ڈولتا ہوا ان کا تولیہ ہمیں یہ اعلان کر کے دکھائی دیتا کہ موصوف تشریف لے آئے ہیں۔"

اچھا۔ "لیکن سوال پھر وہی ہے کہ ہمارے لیے کیا لائے ہیں؟"

"کوئی امید نہ رکھی جائے۔" زارا نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"چونکہ ان کے ہمراہ تشریف لانے والا بیگ کافی ہلکا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی مناسب تلاشی لینے پر بھی اس میں سے ماسوائے ایک عدد ڈھاکہ کی ململ کے دوپٹے اور چند جڑی بوٹیوں کے اور کچھ برآمد نہیں ہو گا۔"

"ڈھاکہ کی ململ کا دوپٹہ؟" بشریٰ نے اشتیاق سے زرقا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بھلا کس کے لیے؟"

"صاف ظاہر ہے بی بی جان کے لیے اور کس کے لیے؟" زارا نے سر پیٹا۔

"بھئی۔ انہوں نے بچپن ہی سے انہیں پالا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان کی پرورش کا تعظیم کار یہ ہم نے تو سر انجام نہیں دیا کہ وہ خواہ مخواہ ہمارے لیے تحفوں کی صورت میں خرچا کرتے پھریں۔"

"اور جڑی بوٹیاں؟" بشریٰ نے پوچھا۔

"وہ تو سندر بن کے جنگل سے بطور خاص تایا جی محترم کے حکمت خانے کے لیے لائی گئی ہیں۔ تاکہ سندر ہیں اور بوقت ضرورت اہل محلہ کے کام آ سکیں۔"

"اف۔ کتنے بد نصیب ہیں ہم لوگ۔" بشریٰ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "صبح سے راستے پکا پکا کر بے حال ہو رہے ہیں۔ اور قسمت میں ڈھاکہ کی ململ کا دوپٹہ تو دور کی بات ہے۔ ایک چھوٹی سی جڑی بوٹی بھی نہیں۔ لو میرے خدا۔

ہمارا کیا بنے گا؟"

"جو بھی بنے گا فی الحال تو جلدی سے یہ ناشتہ ماسی مہراں کے ہاتھ اوپر بھیج دیں۔"

"ماسی مہراں کیوں؟" بشریٰ نے مصنوعی خفگی کے ساتھ کہا۔ "میرا سگا ماموں زاد بھائی ہے۔ میں خود لے کر جاؤں گی۔"

"زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔" بہت دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی زرقا نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔" بشریٰ نے فوراً جواب دیا۔ "اس اسمبلی میں تمہاری سیٹ بک ہو چکی ہے۔ تمہاری جگہ اور کوئی نہیں لے سکتا۔"

"اور اگر لینے کی کوشش کی گئی تو!" زرقا نے مسکرا کر پوچھا۔

"کوئی مسئلہ ہی نہیں باجی۔" زارا بول اٹھی۔ "تم بھائی صاحب کے ساتھ مل کر اس کا سر توڑ دینا۔ فوجیوں کو تو ویسے بھی دوسروں کا سر توڑنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔"

"ہاں۔ اگر یہ "دوسرے" دشمن ہوں تو۔" زرقا نے وضاحت پیش کی۔ "اپنوں سے تو پیار کیا جاتا ہے۔ ان کے سر نہیں توڑے جاتے۔"

"واہ بھئی کیا بات ہے۔" بشریٰ نے شرارت سے زارا کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا زبردست وکالت کی جا رہی ہے اپنے محبوب کی۔ واہ بھئی۔ جواب نہیں۔ عاشق ہوں تو ان جیسے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ ہماری آج کی اس تمام گفتگو میں بے چارہ محبوب تو بھوکا ہی رہ جائے گا۔" زارا نے ناشتے کا سجا ہوا خوان اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن بشریٰ نے لپک کر خوان اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اللہ خیر۔" کہہ کر وہ باورچی خانے سے نکلی اور لرزتے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں خوان تھام کر اس میں دھری گئی اشیاء کے وزن کو کوستی احتیاط سے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر آگئی۔

"معزز مہمان نہ جانے کہاں ہے؟" اس نے دل میں سوچتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

وہ خوان رکھ کر مصطفیٰ کمال کی تلاش میں باہر بالکونی کی طرف جانے کے لیے آگے بڑھی ہی تھی کہ ملحقہ چھوٹے کمرے سے مہمان کی تشریف آوری ہوئی اور پرفیوم کی مہک ہر طرف پھیل گئی۔

"سلام بھائی جان" کہہ کر بشریٰ آگے بڑھی اور مصطفیٰ کمال نے شفقت سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس طوفان میل کی آمد کب ہوئی؟"

"ابھی صبح سویرے۔" بشریٰ نے اطلاعی انداز میں کہا۔ "بی بی جان تو کب سے آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔"

"اوہ" مصطفیٰ کمال نے تاسف کے انداز میں کہا۔ "میں ذرا تیار ہو رہا تھا۔"

"آپ زیادہ تیار شیار نہ ہوا کریں۔ ورنہ پریاں عاشق ہو جائیں گی۔"

"ہونہہ" اس نے مصنوعی سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اپنے ایسے نصیب کہاں بشریٰ بی بی! ویسے میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ مجھ پر کوئی پری نہیں بلکہ ایک چڑیل عاشق ہے۔"

"جی بھائی جان!" بشریٰ نے سر ہلایا۔ "میں جانتی ہوں اس چڑیل کو۔ اس کا نام انگریزی کے حرف زیڈ سے شروع ہوتا ہے اور نام کے بیچ میں "ق" بھی آتا ہے۔ ہے ناں بھائی جان؟" "یا میرے خدا۔" مصطفیٰ کمال نے اس قدر طویل تمہید پر اپنا سر تھام لیا۔ "بہت بولتی ہو تم۔ کیا ناشتے میں بادام کھائی ہو؟"

یکایک بشریٰ کو خیال آگیا۔

"میں آپ کے لیے ناشتہ لائی ہوں۔" اس نے خوان پر سے کپڑا ہٹاتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے آپ کو خیال تو آیا۔" مصطفیٰ کمال نے خوان پر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔ ایک بات تو بتاؤ۔ یہ ناشتہ تم میرے لیے لائی ہو یا پھر بھولو پہلوان کے لیے۔"

"آپ کے لیے ہی ہے تاکہ آپ بھولو پہلوان بن جائیں۔" بشریٰ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

"بسم اللہ۔" کہہ کر مصطفیٰ کمال نے خوان اپنی طرف بڑھایا۔ دیسی گھی سے تیار شدہ سوجی کے حلوے کے ڈونگے کی دوسری سمت ایک سفید رقعہ جھانک رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رقعہ اٹھایا اور وہی مانوس تحریر سامنے تھی۔

"ہمارے لیے کوئی تحفہ نہیں لائے۔ کنجوس مکھی چوس۔" وہ مسکرایا اور اس نے اٹھ کر قریبی الماری سے کاغذ اور قلم نکال کر جواب تحریر کیا۔

"ہمارے دل سے بڑھ کر قیمتی تحفہ بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ رہا کسی مادی تحفے کا سوال تو محترمہ آپ کے لیے تحفہ حاضر ہے۔ میرے سرہانے پڑی ہوئی میز پر رکھا ہے۔ اگر ہمت ہے تو کسی بھی وقت آکر اٹھا لیں۔"

نہایت احتیاط سے رقعہ تہہ کرنے کے بعد حلوے کے ڈونگے کے نیچے رکھ دیا گیا اور اسی قدر ناشتہ کیا گیا جس قدر کہ گنجائش تھی۔ بہت دیر کے بعد ماسی مراں نے خوان سمیٹا اور بچے باورچی خانے میں لے آئی۔ ان کے بعد قدم بہ قدم زینہ طے کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال نیچے آیا اور ہر قدم کی آواز کے ساتھ زرقا کا دل دھڑکتا رہا۔ نگاہیں حیا سے جھکی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھ جس میں دلی جذبات کے اظہار سے سجا رقعہ دبا ہوا تھا پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

باورچی خانے کے دروازے پر فقط ایک پل کے لیے رک کر مصطفیٰ کمال نے اس دل کش منظر پر نگاہ ڈالی۔ اور پھر لبوں پر ایک شرارتی مسکراہٹ سجائے ہوئے سامنے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں بی بی جان ان کی منتظر تھیں بہت سا وقت خاموشی کے ساتھ گزر گیا۔

"باجی۔" زارا نے آواز دی۔ اور وہ جو خدا جانے کس جہاں میں کھوئی ہوئی تھی۔

"اس بے چارے رقعے پر کچھ رحم کریں۔ اس غریب کو بہت پسینہ آ رہا ہے۔"

زرقا نے چونک کر مٹھی کو اپنی کمر کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی لیکن زارا نے بہت تیزی سے اس کی مٹھی کھول کر تہہ شدہ کاغذ اپنے قبضے میں کر لیے۔

"دیکھوں تو ذرا۔" اس نے رقعہ کھولتے ہوئے کہا۔

"میرے پیا کا کیا سندیس آیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے تحریر پڑھی اور پھر دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھتے ہوئے بالکل پھاپھا کٹنیوں والے انداز میں بولی۔

"اوہ۔ تو اب یہ تحفہ وصول کرنے کے لیے تو باقاعدہ واردات کرنی پڑے گی۔"

"کیسی واردات؟" بشریٰ نے اندر آتے ہوئے سوال کیا۔ اور رقعے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"چوری پکڑی گئی۔" بشریٰ نے شرارت سے کہا۔

"اب آپ کیا کریں گی؟"

"کسی کو بتانا نہیں!" زرقا نے کانپتی ہوئی آواز میں التجا کی۔

"میں تو رشوت لوں گی۔" بشریٰ نے صاف طور پر کہہ دیا۔

"نقدی کی صورت میں یا پھر کسی نذرانے کی شکل میں؟" زارا نے پوچھا۔

"نذرانے کی شکل میں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "اگر آپ مجھے اپنی وہ گلابی رنگ کی لپ اسٹک دے دیں جو میں گزشتہ سال سے مانگ رہی ہوں اور ساتھ ہی فضل دین کی ہٹی سے خریدا گیا ایک عدد ریشمی سوٹ۔ ساتھ میں چپل اور!"

"اور پالفیقے کی دکان سے چرایا گیا دس لیٹر دودھ۔" زارا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔" بشریٰ نے تائید کی۔ "ہم اس دودھ کی ربڑی بنا کر چوبارے پر مقیم اعلا حضرت کو پیش کریں گے۔"

"ہرگز نہیں۔" زارا نے گویا کہ ویٹو پاور کا استعمال کیا۔ "انہوں نے بنگال کی مچھلی اتنی زیادہ کھائی ہے کہ اس کے بعد ربڑی کا استعمال خدانخواستہ اس مرض میں مبتلا کر سکتا ہے۔ جس میں بندہ "ڈپ کھڑا" ہو جاتا ہے۔ ہم اس دودھ سے کھیر بنا کر ان کی آمد کی خوشی میں محلّے میں تقسیم کریں گے۔"

پھر بنگال سے لائے گئے اس تحفے کو حاصل کرنے کے لیے تدبیر سوچی جانے لگی جس کی اطلاع بذریعہ رقعہ ایک دھمکی کی صورت میں دی گئی تھی۔

بشریٰ نے نصف شب کے قریب عمل میں لائی جانے والی اس عظیم الشان واردات کا محل وقوع واضح کرتے ہوئے کسی ماہر ہدایت کار کی طرح ہدایات جاری کرتے حسب عادت دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"ادھر سے آئیں گی باجی۔ اور ادھر سے میں اور تم۔" اس نے اپنی اور زارا کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم۔ اور مرکزی کردار بھلا کہاں گیا۔" زارا نے ٹوکا۔

"بھئی وہ تو ہیرو کے روپ میں اوپر چوبارے پر موجود ہوگا۔" بشریٰ نے تصحیح کی۔

"اب ہیروئن آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتی ہوئی جب اوپر پہنچے گی تو وہاں...!"

"آگے دلہن کھڑا ہوگا۔" زارا نے حسب عادت بات کاٹ کر کہا۔

"لیکن دلہن کون ہوگا؟" اس نے سوال کیا۔

"چلو۔ ایسے کرتے ہیں کہ اس اسٹوری میں پالفیقے کو دلہن بنا دیتے ہیں۔" بشریٰ نے اپنی رائے پیش کی اور جب کھلکھلاہٹ ہر طرف پھیل گئی تو صحن میں کام کرتی ہوئی ماسی مراں نے باورچی خانے کے اندر آکر ٹوکا۔ "تم نے کیا کھی کھی لگا رکھی ہے لڑکیو! بی بی جان ناراض ہو رہی ہیں۔"

"اچھا۔" بشریٰ نے حیرت سے کہا۔ "میں تو سمجھی تھی کہ وہ اپنے لاڈلے سپوت کے لاڈ اٹھانے میں اتنی مگن ہوں گی کہ انہیں باہر کی دنیا کا کوئی ہوش ہی نہیں ہوگا۔ چلو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آپ لوگ اس وقت اپنا کام ختم کریں۔ میں ذرا اہل محلہ کی خبر لے لوں۔ باقی پروگرام شام کو طے کریں گے۔" وہ اپنا آنچل سمیٹتی باہر چلی گئی۔

وقت نے باقی ماندہ چاروں پہر بدلے اور شہر پر شام چھائی۔ زندگی حسب معمول رواں دواں رہی اور شب کی آمد کے بعد ایک بے تحاشا دھڑکتے ہوئے دل نے لرزتے کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ اوپری چوبارے پر جانے کے لیے سیڑھیوں پر اپنا سفر شروع کیا۔ سارا شہر سو رہا تھا۔ لیکن دل کی دنیا بیدار تھی۔

اس دنیا کے اندر ایک ڈر تھا۔ ایک خوف تھا۔ اور حجاب بھی اور آنے والے لمحوں کی سرشاری کا احساس بھی کہ طالب محبوب کی طلب پر اپنی وفاؤں اپنی اداؤں اور اپنے احساسات کے اظہار سمیت حاضر خدمت تھا۔

وہ شاید چودھویں کی شب تھی۔ کہ پورے چاند کی چاندنی بالکنی سے اپنا راستہ بناتے ہوئے کمرے تک چلی آئی تھی۔ باہر کی فضا چاندنی کے نور سے روشن تھی اور اندر کی دنیا میں سماعتوں نے نیم غنودگی میں بھی احساس دلایا تھا کہ قدموں کی ہلکی آہٹیں اب قریب آ چکی ہیں۔

چاند دریچے میں اتر آیا۔ آہٹیں آگے بڑھیں۔ اور پھر لرزتے آنچل اور چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ ایک سایہ سرہانے کی سمت آن رکا۔ جھکتی ہوئی نگاہوں نے میز پر دھرے سنہری پنی میں ملفوف پیکٹ کو دیکھا۔ قدم آگے بڑھے۔ لرزتے کانپتے ہوئے ہاتھ نے آگے بڑھ کر اس سوغات کو اٹھانا چاہا۔ کہ اچانک جوابی وار کے طور پر ایک مضبوط ہاتھ نے کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ چھن چھن کرتی ہوئی کلائی چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں اور درد کی ٹیس نے "سی" کی آواز کا روپ دھار کر فریق مخالف کو یہ احساس دلانے میں ذرہ بھر بھی دیر نہ کی کہ واقعی انجانے میں اس سے کوئی زیادتی سرزد ہو گئی تھی۔

کلائی پر گرفت کمزور پڑ گئی اور معذرت کے بول لبوں پر آ گئے۔

"اوہ۔ آئی۔ ایم۔ سوری۔"

چمکتا ہوا چاند بالکنی کے اوپر ٹھہر گیا۔ اور اندرونی دریچے سے اندر آتی ہوئی روشنی نے ایک دل کش منظر عیاں کر دیا۔

سرخ چہرے پر حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی سیاہ پلکیں۔ انجانے احساسات سے لرزتا کانپتا ہوا کانچ کا وجود۔ جس کے اندر آرزوؤں کا اک جہان روشن تھا۔ سفید کلائی پر تھرتھراتے ہوئے لہو کی وہ بوندیں۔ جو گہری خراشوں سے ابھر کر اپنی وفاؤں کے خراج کی صورت میں ایک حقیقت بن کر چمک رہی تھیں۔ دل میں درد کا ایک احساس اور کانپتے ہوئے وہ لب۔ جو اس وقت ایک تذبذب کی کیفیت میں کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن چپ تھے۔

بہت دیر تک خاموشی رہی اور پھر یہ لب اپنے احساسات کو آواز کی صورت میں سامنے آ گئے۔

"ان چوڑیوں کی طرح کہیں میرے خواب بھی نہ توڑ دینا۔" بہت سے پل گزر گئے اور شاید بے خبری میں ہی مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں نے تحفہ ان ہاتھوں میں منتقل کر دیا۔ جو فرش پر سے کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے سمیٹ کر اپنے دامن میں ڈال رہے تھے۔

"خواب ٹوٹنے کے لیے نہیں۔ بلکہ تعبیریں پانے کے لیے دیکھے جاتے ہیں۔" بڑی چاہت کے ساتھ جواب دیا گیا۔

اپنی ذات کے لیے اپنی زندگی کی طرف سے محبت کا تحفہ اپنے آنچل میں سمیٹ کر جب وہ باہر جانے لگی تو راستہ روک لیا گیا۔

"آپ ہمیں کوئی تحفہ نہیں دیں گی؟" محبت بھرا لہجہ ایک التجا اور ایک فریاد بن کر دل میں اتر گیا۔

فقط چند پل سوچ میں گزرے۔ پھر اپنا گلابی آنچل پھاڑ کر کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے اس میں سمیٹ کر گرہ لگائی گئی اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ یہ نذرانہ اپنے محبوب کے حضور پیش کر دیا گیا۔

دریچے سے اندر جھانکتے ہوئے چاند نے بھی یہ حسین منظر اپنی آنکھوں میں جذب کر لیا۔ کہ محبوب نے آنچل

میں بندھے ہوئے ان ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور شرف قبولیت بخش دیا گیا۔

قدم دروازے کی طرف بڑھے تو آواز آئی۔

"زری۔ میرا انتظار کرنا۔"

اور زری۔ زرقا بیگم جب چھم چھم نیر بہاتی ہوئی نیچے آئیں تو سیڑھیوں کے پاس کھڑی زارا حیران رہ گئی۔

"کیا ہوا باجی؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"کچھ نہیں۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ روتی ہوئی آنکھوں نے کمرے تک کا فاصلہ بمشکل طے کیا۔ خراش زدہ کلائی پر پٹی لپیٹتے ہوئے زارا نے جل کر کئی گالیاں بشریٰ کو دیں۔ جس نے انہیں یہ ساری واردات کرنے کا مشورہ دیا تھا اور اب خود مزے سے سو رہی تھی۔ پھر دونوں نے احتیاط کے ساتھ پیکٹ کھولا۔ ڈھاکہ کی ململ کا ست رنگی دوپٹہ۔ سلک کا سوٹ اور خوشبو کا تحفہ ہاتھوں میں آ گیا۔

"یہ تو میں لوں گی۔" زارا نے خوشبو کی شیشی اٹھا کر کہا۔ "اللہ باجی۔ کتنی زبردست خوشبو ہے۔"

زرقا کی نظریں اس تحریر پر تھیں۔ جو دوپٹے پر لگی تھی اور جس پر سنہری لفظوں سے لکھا گیا تھا۔

"ہم عزتوں کے محافظ ہیں۔ اور اس آنچل کی پاس داری کی قسم کھاتے ہیں۔"

"شکریہ۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اگر آپ ہماری عزت کے محافظ ہیں تو ہم بھی ان وفاؤں کے محافظ ہیں۔ جو وفائیں ہماری زندگی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

رات بھر چاند آسمان پر رکتا ٹھہرتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا اور سورج بادشاہ نے اپنی بادشاہت کا آغاز کر دیا۔

باورچی خانے میں زندگی مختلف آوازوں کے روپ میں جاگ اٹھی۔ شوخ و چنچل بشریٰ اٹھلاتی ہوئی دروازے میں آن رکی۔ زارا انڈے پراٹھا بنا رہی تھی۔

"مجھے دو عدد پراٹھوں کے ساتھ ایک عدد آملیٹ مع اور بڑا مگ چائے کا پیش کیا جائے۔" اس نے ایک ہاتھ کلائی پر رکھ کر اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"ہم کوئی آپ کے نوکر ہیں؟" زارا نے پراٹھا پلٹتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ ہمارے نوکر نہیں تو کیا ہوا؟ ہم تو آپ کے غلام ہیں ناں۔ چنانچہ اسی بات پر گرما گرم ناشتہ پیش کیا جائے۔" بشریٰ دائیں بائیں دیکھے بغیر اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ ایک دم اس کی نظر زرقا پر پڑی۔ جو بڑھے پر نچی ہوئی جائے پی رہی تھی۔

"اللہ باجی۔" وہ اس کے قریب آ کر پوچھنے لگی۔ "آپ کی کلائی کو کیا ہوا؟"

"اپنی بلی نے پنجہ مارا ہے۔" زارا نے لاپروائی سے کہا تو یکایک بشریٰ کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ زرقا کا بازو تھام کر بولی۔

"سچ سچ بتاؤ تم دونوں۔ واقعی کسی بلی نے پنجہ مارا ہے یا پھر کسی چیتے نے؟"

"واقعی آپ ایک ذہین خاتون ہیں۔" زارا نے جواب دیا۔ "یہ پنجہ بلے نے ہی مارا ہے۔"

"چلیں چھوڑیں جی اس قصے کو یہ بتائیں تحفے میں کیا دیا گیا ہے؟"

"دل کے ساتھ اور بھی بہت کچھ۔" زارا نے بتایا۔

"اور ہمارے لیے کیا لائے ہیں؟" بشریٰ نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں ماسوائے دعاؤں کے۔" زارا نے کہا۔

"بشریٰ باجی! آپ بھی عجیب بات کرتی ہیں۔ بھئی ہم کوئی ان کے "وہ" تھوڑی ہیں۔ جو وہ مفت میں ہمیں تحفے دیتے پھریں۔"

"واہ ری قسمت۔" بشریٰ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "بھائی ہمارا ہے۔ اور تحفے دوسروں کو مل رہے ہیں۔ چلو آؤ۔ مل کر دعا کرتے ہیں کہ اللہ پاک ہمیں بھی کوئی تحفے دینے والا عطا کرے۔"

بشریٰ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ ماسی میراں نے آ کر اطلاع دی۔

"آپ کو بی بی جان بلا رہی ہیں۔"

"اچھا۔" کہہ کر وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی سامنے کمرے میں گئی۔ تو دیکھا کہ بی بی جان کئی ایک تحائف پیکٹ کی صورت میں لیے سامنے چارپائی پر بیٹھی تھیں۔

"دیکھو۔ یہ کمال اپنی بہنوں کے لیے لایا ہے۔"

"اللہ اماں! میری دعا اتنی جلدی قبول ہو گئی۔"

اس نے خوشی کے مارے چلاتے ہوئے زارا کو آواز دی۔ وہ حسب عادت دوڑتی ہوئی چلی آئی۔ مشرقی پاکستان سے آئی ہوئی ان سوغاتوں میں ڈھاکہ کی ململ کے وہ دوپٹے سرفہرست تھے۔ جو ایک بھائی عزت کے پرچم بنا کر اپنی بہنوں کے سروں پر ڈالنے کے لیے لایا تھا۔

"اف میرے پیارے بھائی۔ یو آر گریٹ۔" زارا نے خوشی کے اظہار کے طور پر کہا۔ تو بشریٰ بولی۔

"ابے تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ اتنے گریٹ نہیں تھے۔ اف میرے خدا۔ تیرے یہ فانی بندے بھی کتنے مادہ پرست ہیں۔"

"ایک تو وہ چھوٹا سا لائے تھے۔" زارا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اتنی زیادہ چیزیں لائے کہاں سے؟"

"مطلب تم کھاؤ پیو۔" بشریٰ نے کہا۔ "تمہیں پیڑ گننے سے کیا مطلب؟"

"بھئی عمرو عیار کی زنبیل ہے ان کا بیگ۔" زارا بولی۔ "اب ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ واپسی پر ہم بھی ان کے بنگالی دوستوں اور ان کی فیملیز کے لیے تحفے بھیجیں۔"

"ہاں بالکل۔" بشریٰ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ "ویسے بھی ہماری کمیٹی نکلنے والی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ آج ہم واپس چلیں۔" "بی بی جان نے بشریٰ سے کہا۔ "پرسوں واپس آ جائیں گے۔"

"ہرگز نہیں اماں جانی۔" بشریٰ نے ان کے گلے میں لاڈ سے بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تھوڑے ہی دنوں کی تو چھٹی ہے کمال بھائی کی۔ بس اب ان کی واپسی کے بعد ہی ہماری بھی واپسی ہو گی۔ ویسے بھی اب یہاں ایک اہم مشن سرانجام پانے والا ہے۔" وہ رازداری سے بولی۔

"کیسا مشن؟" زارا نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ ماسی میراں ہے نا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ میجر صاحب کی واپسی پر فیقے کی اماں شادی کے لیے دن مقرر کرنے آ رہی ہیں کیونکہ فیقا کہتا ہے کہ وہ اپنے جگری یار کے بغیر ہرگز شادی نہیں کرے گا۔"

"واہ۔ کیا زبردست پروگرام ہے۔" زارا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تالی بجائی۔

"بچنے کتنی خوش ہوئی۔"

"بچنے کو تو چھوڑو۔" بشریٰ نے کہا۔ "مجھے تو بے چارے اس گھوڑے کی فکر ہے۔ جس پر فیقا دولہا بن کر سوار ہو گا۔"

"واقعی۔" زارا نے تشویش سے کہا۔

"دو۔ جیسے اخبار میں کسی حادثے کے بعد خبر آتی ہے ناں کہ زخموں کی تاب نہ لا کر ہلاک ہو گئے۔ تو بہت ممکن ہے کہ گھوڑے کے متعلق بھی ایسی ہی خبر آئے کہ بے چارہ فیقے کی تاب نہ لا کر ہلاک ہو گیا۔"

"آہ بے چارہ گھوڑا۔" بشریٰ نے سرد آہ بھری۔ "نہ جانے اس وقت کہاں اپنی زندگی کی آخری گھاس چر رہا ہو گا۔"

☼ ☼ ☼

خوشی اور چاہتوں کے یہ پل بہت جلدی گزر گئے۔ دن دوپہر سے سہ پہر اور عصر کا رنگ لیتے ہوئے پھر شام پر آن رکا۔ مصطفیٰ کمال کی واپسی ہوئی۔ ان کے پاس اچھے حالات کی کوئی خبر نہ تھی۔ بظاہر وہ مسکراتا رہا اور بہنوں سے تحفوں کے بدلے میں شکریہ کے وصول کرتا رہا لیکن دل میں مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت کو چھپانے کی ناکام کوشش میں کسی کسی وقت پانی کے چند نمکین قطرے اس احساس کے ساتھ در آتے رہے کہ اب جدائی قریب بے حد قریب تھی۔

اور اس کا پس منظر کیا تھا؟

ارباب اقتدار و اختیار کی طرف سے بریگیڈیر سراج کو ملنے والی ایک زبردست شٹ اپ کال اور سرزنش نے ان کا مزاج خاصا برہم کر دیا تھا۔

اس پر ان کی مغربی پاکستان پوسٹنگ کے احکامات نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے مصطفیٰ کمال اور حسن امام کی چھٹی کے احکامات کو یکسر منسوخ کرتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ واپسی کے نئے حکم کو جاری کرنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہ کیا۔ مصطفیٰ کمال تو یہ وار سہہ گیا۔ لیکن حسن امام بہت آزردہ تھے۔

چونکہ گزشتہ دنوں والدہ صاحبہ اور بہنوں کی زبردست کوششوں کے بعد اور صدیقی صاحب کے بے مثال تعاون کے باعث منزہ میر علی کے لیے میجر حسن امام کے رشتے کو شرف قبولیت بخشا گیا تھا۔ بلکہ ملکی حالات کے پیش نظر نہایت سادگی کے ساتھ تقریب نکاح اور رخصتی کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

راولپنڈی میں دوستوں کی ملاقات میں حسن امام کے چہرے پر کھلی ہوئی مسکراہٹ نے یہ راز عیاں کر دیا کہ بس اب من کی مراد پوری ہونے والی تھی۔

"مبارک ہو یارا" مصطفیٰ کمال نے نہایت گرم جوشی

کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے حسن امام سے کہا۔

"تو بتا تیرے معاملے کا کیا بنا؟"

"معاملات تو سب ٹھیک جا رہے تھے۔ لیکن تایا جی نے حسب عادت اگلے بچاگن کی تاریخ دے دی۔"

"ویری سیڈ یار۔" حسن امام نے افسوس کا اظہار کیا۔
"ویسے یار۔ کیا یہ تمہارے تایا جی پچھلے جنم میں کہیں جج تو نہیں تھے؟"

"جج صاحبان بھی اتنی تاریخیں نہیں ڈالتے۔ جتنی تایا جی نے ڈالیں۔" مصطفیٰ کمال نے کہا۔

"تو سنا۔ کیا پروگرام ہے؟"

"اگلے جمعہ کی شام نکاح کی تقریب ہے اور ہفتے کو ولیمہ۔ لیکن سن لے۔ تو مجھے اس اہم موقعہ پر سہارا دینے کے لیے دو دن قبل آئے گا۔"

"ضرور آؤں گا۔ آخر تجھے مایوں کا پیلا جوڑا بھی تو پہنانا ہے۔" مصطفیٰ کمال نے کہا۔

"شکر ہے یار! مشرقی پاکستان واپسی سے پہلے ہی تیرے ہاتھ پیلے ہو گئے اور میرا بوجھ ہلکا ہو گیا اور اس تمام واردات کا فائدہ یہ ہو گا کہ اب واپسی کے سفر میں میری ذات شریف کم از کم جہاز کی سیٹ بدلنے کی کوفت سے تو بچ جائے گی۔" بریگیڈیئر سراج کی آمد ہوئی تو مصطفیٰ کمال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلو جناب حاضر ہو جاؤ۔ بریگیڈیئر صاحب تمہارے ہاتھ پیلے ہی نہیں بلکہ نیلے کرنے کے لیے تشریف لے آئے ہیں۔"

اپنی زندگی کے خوشگوار لمحات میں نوک جھونک کرتے ہوئے وہ دونوں جو نیئرز جب حالات سے آگاہ ہوئے تو حیرت کے علاوہ مایوسی نے بھی ان کا گھیراؤ کر لیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کیا اتنی گہری ہو چکی تھی؟ دونوں حصوں کے درمیان سیاست دانوں کی انا اور ضد کی جنگ حالات کو اس نہج پر لے آئی تھی۔ جہاں وطن عزیز کا یہ خطہ ایک سلگتا ہوا آتش فشاں بن چکا تھا۔ نفرت کی سلگتی ہوئی چنگاریاں فی الحال شعلہ نہیں بنی تھیں۔ جبکہ مرکز میں متمکن فوج کے اعلا عہدیدار چھوٹے سے چھوٹے نکتے کو بھی اپنے نوٹس میں لا چکے تھے۔

ایک فلمی اداکار کے بیان کے علاوہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر روشن خیال کی طرف سے طلباء میں تقسیم کردہ پمفلٹ بھی ضبط کر لیے گئے تھے۔ جس میں برصغیر کی تقسیم کو ایک "احمقانہ فعل" قرار دیتے ہوئے معصوم ذہنوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ جغرافیائی خطہ اپنی ایک الگ حیثیت اور پہچان رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیوں کے جواب میں وقت کی ضرورت کے تحت علم بغاوت بلند کرنا جہاد کے زمرے میں آتا ہے۔ معصوم ذہنوں نے روایتی جذباتی عمر کے جوش اور ولولے کے تحت اس اثر کو قبول کرتے ہوئے علم بغاوت بلند کرنے کی سعی کر لی اور گورنمنٹ کالج کے سابقہ طالب علم پروفیسر روشن خیال ہیرو بن گئے۔ ایسے کئی مزید نکات پردہ اسکرین پر واضح تھے۔ جب ہی تو بریگیڈیئر سراج کی طبی سرزنش اور تبدیلی کا عمل سامنے آ چکا تھا۔

میس روم میں وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ بریگیڈیئر سراج نے واضح طور پر حکم جاری کر دیا تھا کہ ان کی چھٹی منسوخ کی جا رہی ہے۔ لہٰذا وہ واپسی کے لیے تیاری کریں۔ حالانکہ یہ چھٹی ان کا حق بنتی تھی۔ لیکن اپنے سینئر کے سامنے وہ بے بس تھے۔

"میں خود بات کروں گا۔" بہت دیر تک سوچنے کے بعد مصطفیٰ کمال کی آواز آئی۔

"تم کیا بات کرو گے؟" حسن امام نے سوال کیا۔

"یہی کہ اگر یار من کی خاطر التجا اور فریاد کرنے کے علاوہ پاؤں بھی پکڑنے پڑے تو پکڑ لوں گا کہ مجھے بے شک اپنا ہمراہی بنانے کا شرف حاصل کر لیں۔ مگر خدارا میجر حسن امام کو یہیں قیام کرنے دیں۔ بڑی مشکل سے تو اس کے باجے بجنے کا انتظام ہوا ہے۔ اللہ کے واسطے اس کا پروگرام خراب نہ کریں۔ ہم آپ کے بال بچوں کو دعائیں دیں گے۔" "اس قدر مایوس کن حالات میں۔ اتنی لمبی تقریر سن کر حسن امام کے چہرے پر مسکراہٹ تو ضرور ابھر آئی لیکن اس نے بدستور سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

"تو کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری بات مان لی جائے گی؟"

"بتایا ہے ناکہ میں صرف بات ہی نہیں "التجا اور فریاد" بھی کروں گا۔ پاؤں پکڑنے تک کی گارنٹی تو دے چکا ہوں لیکن کیا کروں۔ اب تمہارے نزدیک تو میری وفاداریاں بھی مشکوک ہو چکی ہیں۔" مصطفیٰ کمال نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔

"تو پھر تو یہ ایکشن کس وقت کرے گا۔ جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد یا اس سے پہلے؟" حسن امام نے پوچھا۔

"ابھی۔ اسی وقت فوراً۔" مصطفیٰ کمال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں۔" حسن امام نے اطلاع دی۔

"ہمیں بے آرام کرنے کے بعد انہیں آرام کرنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ میں یہ زیادتی ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔" مصطفیٰ کمال باہر نکل گیا اور آنے والے روشن دنوں کی تصویر نگاہوں میں بسائے ہوئے حسن امام اسی تشویش میں مبتلا رہا کہ خدا جانے دوستی کے جذبات میں بہہ کر آخری حدوں تک جانے والا یہ پیارا دوست کیا کرے گا؟

بہت دیر کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ وہ دو عدد اہم ترین اطلاعات کے ساتھ واپس آیا تھا۔ نمبرون یہ کہ بریگیڈیئر سراج نے بالآخر یہ اجازت مرحمت فرما دی تھی کہ میجر حسن امام اپنے چہرہ مبارک کو سہرے کی زرتار لڑیوں سے سجا کر باجے گاجے کے ساتھ منزہ میر علی کو بیاہ کر لانے کے عظیم الشان مقصد کے لیے فقط دس دن مزید یہاں قیام فرما سکتے ہیں اور دوستوں کی خاطر قربانی دینے کی عظیم روایات کو برقرار رکھتے ہوئے مصطفیٰ کمال کو دو دن کے بعد ان کے ہمراہ ڈھاکہ واپس جانا پڑے گا۔

دوسری اہم ترین اطلاع یہ تھی کہ مغربی پاکستان سے بریگیڈیئر خلیل الرحمن شعلہ کو بریگیڈیئر سراج کی جگہ پوسٹ کیا جا رہا تھا اور اب بریگیڈیئر سراج کا دانہ پانی کس جگہ کے لیے مختص ہو چکا تھا۔ فی الحال اس بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ یہ اطلاعات بم پہنچانے والے جگری یار نے انہیں تمام سیکرٹ رازوں میں رکھنے کا وعدہ لیا تھا۔

مجھے مصطفیٰ کمال نے واقعی زبردست معرکہ مارا تھا۔ مگر مارے تجسس کے اس کی طرف سے سوالات کی آمد نے مصطفیٰ کمال کو زچ کر دیا۔

"اگر تو مجھ سے یہ راز اگلوانے کی کوشش کرے گا تو تجھے سو فیصد ناکامی ہو گی۔ بھائی میرے تو تم کہاں مجھے پڑ گئے سے بھلا کیا فائدہ ہو گا اور ہاں اب اگر تم نے میرا دماغ چاٹا تو میں جا کر ان سے صاف طور پر کہہ دوں گا کہ "آئی ایم سوری سر۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تیری مہربانی ہے دوست۔ تو واقعی بہت عظیم انسان ہے۔" "اگر میں عظیم ہوتا تو میرے تایا جی محترم میرے معاملے میں پنجاب کی روایتی داستان "ہیر رانجھا" میں "چاچا کیدو" کا کردار ادا کرتے ہوئے ہر بار میری بات اگلے بچاگن پر نہ ٹالتے۔"

"کوئی بات نہیں یار!" حسن امام نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔
"تیرا تو وقت مقرر ہو گیا ہے نا۔ اسی لیے تو ان کی حمایت کر رہا ہے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔" حسن امام نے کہا۔
"مگر مجھے تو یہ سوچ کر ہی ہول اٹھنے لگا ہے کہ تیرے بغیر میں سہرا کس طرح باندھوں گا؟"

"رسیوں سے باندھ لینا۔" مصطفیٰ کمال نے برجستہ کہا۔

"خوب مضبوطی کے ساتھ بندھا رہے گا۔ کم از کم چار چھ دن تک اترے گا نہیں۔"

میس کے کمرے میں گونجتے ہوئے قہقہوں نے یاسیت کی اس فضا کو ایک خوش گوار ماحول میں بدل دیا لیکن چند ہی لمحوں کے بعد اچانک سنجیدگی در آئی۔ مصطفیٰ کمال کہہ رہا تھا۔

"بہتر ہے کہ ہم زندگی سے اپنے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کر لیں۔ حالات ٹھیک نہیں۔ کل کیا ہو گا؟ کچھ پتا نہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" حسن امام نے تائید کی۔
"ہمیں تو یہاں آکر احساس ہوا کہ ہم تو شترمرغ کی طرح ریت میں سر دبا کر "سب اچھا" کی رپورٹ دے رہے تھے۔ حالانکہ رویوں کا واضح فرق نظر آ رہا ہے۔ ویسے یار!" اس نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔
"میرا دل نہیں مانتا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔"

"تیرے دل کی تو بات ہی کیا ہے۔" مصطفیٰ کمال نے جواباً کہا۔

"وہ تو آج کل عشق کے محاذ پر سرپیکار ہے۔ ذرا یہ بھوت اتر جانے دے پھر پتا چلے گا کہ حقیقت کیا ہے؟"

وہ دونوں ڈائننگ ہال کی طرف جانے کے لیے باہر نکلے تو سامنے ستون کے قریب بریگیڈیئر سراج دونوں ہاتھ پشت پر باندھے کھڑے تھے انہوں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر

دونوں پر ڈالی۔

اس وقت ان کے چہرے پر شدید کشمکش کے آثار تھے۔ وہ انتہائی مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کہ وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہے ہوں۔ لیکن کوئی ایسا امر مانع ہو۔ جس کی بنا پر وہ ایسا کر نہیں پا رہے۔ وہ اسی کیفیت میں ان دونوں سے پہلے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ کرسی پر تشریف فرما ہونے کے بعد انہوں نے نیپکن کو گود میں پھیلایا۔ تھوڑا سا بھنا ہوا قیمہ پلیٹ میں ڈال کر چاول لیے اور پھر چمچ کانٹا اٹھا کر خاموشی کے ساتھ پہلا لقمہ لینے کے بعد رک گئے۔ حسن امام اور مصطفیٰ کمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چند لمحے گزر گئے چمچ اور کانٹا پکڑے ہوئے بریگیڈیئر سراج کسی گہری سوچ میں تھے۔

"سر۔" کہتے ہوئے مصطفیٰ کمال نے ان کی توجہ کھانے کی طرف مبذول کرانا چاہی۔ لیکن انہوں نے "شکر الحمدللہ!" کہہ کر چمچ اور کانٹا واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ نیپکن کو گود سے اٹھا کر واپس میز پر رکھتے ہوئے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

حسن امام اور مصطفیٰ کمال کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار باقی نہ تھا کہ وہ خود بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن مصطفیٰ کمال حسب عادت خاموش رہ نہ سکا اور اس نے نہایت تشویش سے پوچھا۔

"سر۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔" بریگیڈیئر سراج کی غصیلی آواز نے دونوں کے چودہ طبق روشن کر دیے۔

"میری طبیعت تو بالکل ٹھیک کر دی آپ لوگوں نے۔" اگرچہ ان کے لہجے نے ان کی اندرونی کیفیت کی عکاسی کر دی۔

تاہم اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے مزاج کو درست سمت میں لانے کی کوشش میں مصطفیٰ کمال نے کہا۔

"سر۔ آپ نے کھانا نہیں کھایا؟"

"ہم نے بہت نمک کھایا مغربی پاکستان کا۔" وہ اونچی آواز میں بولے۔

"خدا کے واسطے اب آپ لوگ ہمیں بخش دیجیے۔" بریگیڈیئر سراج نے درشتی سے کہا۔ وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے۔

ان کا منصب اس بات کا اہل نہ تھا کہ وہ بول سکتے۔ وہ تینوں اسی تذبذب کی کیفیت میں کھڑے تھے کہ ویٹر نے آ کر اطلاع دی۔ میس ریسپشن پر رکھے گئے ٹیلیفون پر بریگیڈیئر صاحب کے لیے ڈھاکہ سے کال موصول ہوئی تھی۔ ان کے اہل خانہ ان کی خیریت جاننا چاہتے تھے۔

"اب آپ جا سکتے ہیں۔" انہوں نے اپنے جونیئرز کو جانے کی اجازت دے دی اور خود تیز قدموں سے چلتے ہوئے فون اٹینڈ کرنے کے لیے چلے گئے۔ تو گویا اب اس جہان کی روشنیاں آہستہ آہستہ گل ہو رہی تھیں۔ کیا دراڑیں پڑنے کا عمل شروع ہو چکا تھا؟ یہ سوال صرف کربناک ہی نہیں۔ بلکہ وحشت ناک بھی تھا۔ پیارے قائداعظم کے پاکستان کو کسی کی نظر لگ گئی تھی؟ اور سب خاموش تھے۔ شاید اس لیے کہ اس وقت کی سیاست بھی اپنے مفادات کی چادر اوڑھے ہوئے بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔

حسن امام اور مصطفیٰ کمال خاموش بیٹھے تھے۔ خوشیاں بڑے عجیب انداز میں زندگی سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ سوچیں بڑی گہری تھیں اور مسائل حل طلب۔ مگر بے حسی کا ایک ایسا عالم طاری تھا۔ جس عالم میں کہیں بھی کوئی روشنی کی کرن باقی نہ تھی۔ فقط بہلاوے تھے۔ جو آنے والے وقت میں پچھتاوے بن سکتے تھے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔

حسن امام نے چائے کا آرڈر دیا کہ شاید تھکے ہوئے ذہن کسی حد تک آسودگی پا سکیں۔ دروازے پر "ٹک ٹک" کی آواز کے ساتھ دستک ابھری اور پھر "یس" کی صورت میں اجازت پاتے ہی ویٹر اقبال اندر آ گیا۔ اس نے چائے کی ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھی اور پھر واپس جانے کے بجائے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" حسن امام نے کہا۔

"سر۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟" مصطفیٰ کمال نے پوچھا۔

"سر۔ وہ بریگیڈیئر سراج صاحب ٹیلی فون پر کسی کو بتا رہے تھے کہ وہ فوج سے استعفیٰ دے رہے ہیں۔" یہ انکشاف باعث حیرت تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" مصطفیٰ کمال نے سوال کیا۔

منڈی بہاؤالدین کا رہنے والا نوجوان اقبال نہایت نیاز

مندی سے بتا رہا تھا۔

"میرا باپ فوج میں حوالدار تھا۔ سرزمین بنگال میں پیدا ہوا تھا۔ میں بنگالی زبان اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ سرزمیں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ خدا کی قسم کر سرزمیں نے خود سنا ہے۔"

یہ اطلاع قطعی طور پر خوش کن نہیں تھی۔ اس سے حالات سنورنے کی بجائے بگڑنے کا خدشہ تھا۔ چونکہ حالات اب ذاتی سطح پر آ چکے تھے۔ لہٰذا ان کا رخ موڑنا حسن امام اور مصطفیٰ کمال جیسے جونیئرز کے بس میں نہیں تھا۔ طے یہی پایا کہ فی الحال تو خاموشی ہی بہتر ہے۔ واپس پہنچ کر حالات کے مطابق چلنا ہی بہتر تھا۔ باقی حالات و معاملات رب پاک کے سپرد کر دیے جائیں کہ بے شک! وہی سب کچھ بہتر کرنے والا ہے۔ کچھ دیر کے لیے نیند کی دیوی مہربان ہو گئی۔

صبح روشن اور چمک دار تھی۔ ان دیکھے خدشات کی وہ دیوی جس نے رات بھر آنکھوں کو ایک اذیت میں مبتلا کیے رکھا۔ کہیں دور دیس پرواز کر گئی تھی۔

اس وقت مغربی پاکستان میں صبح کے آٹھ اور مشرقی پاکستان میں صبح کے نو بج رہے تھے۔ جب مصطفیٰ کمال نے اپنے پیارے دوست حسن امام کو اپنے سینے سے لگا کر رخصت کیا۔ گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے مصطفیٰ کمال نے کہا۔

"او کے جانِ جگر! اللہ کے حوالے۔ ان شاء اللہ اب ڈھاکہ ایئرپورٹ پر ملاقات ہو گی۔"

"ان شاء اللہ۔" حسن امام نے صدق دل سے کہا اور دونوں دوست اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

وقت عصر قریب تھا۔ جب مصطفیٰ کمال کی آمد ہوئی۔ شاہ جی کی بیٹھک کے قریب کھڑی ماسی مراں کی نظر ان پر پڑی۔ اور وہ لپک کر اندر اطلاع کرنے چلی گئی۔ زارا نے جب یہ خوش خبری سنی تو آنکھوں ہی آنکھوں میں بشریٰ کو اطلاع دی۔ جو اس وقت شاہ جی کے لیے چائے بنانے میں مصروف تھی۔ اس نے رات کے کھانے کے لیے چاول چنتی ہوئی زرقا کی طرف دیکھ کر مدھم آواز میں گانا شروع کر دیا۔

سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا

زرقا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں بے اختیار دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔

دروازہ بند تھا اور زارا کہہ رہی تھی۔ "فی الحال تو وہ بیٹھک میں تشریف فرما ہیں۔ ہمارے اور آپ کے بھاگ جگانے کے لیے تھوڑی دیر کے بعد آئیں گے۔ ذرا صبر کریں۔" لب تو خاموش تھے لیکن آنکھیں دید کی متقاضی تھیں۔

زارا نے بھی بشریٰ کے ساتھ اس بھاگ جگانے والی واردات کی تکرار شروع کر دی۔ تو بشریٰ نے اچانک سوال کیا۔

"اچھا ایک بات تو بتا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ فارسی زبان میں "ماہی" مچھلی کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ پنجابی زبان میں "ماہی" محبوب کو کہا جاتا ہے۔ دونوں میں کیا قدر مشترک ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"سمجھ آئے بھی کیسے؟" زارا بولی۔ "یہ زبان کا چکر ہے بی بی۔ ہماری تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم زبانوں کے اس چکر میں پڑنے کی بجائے یہ سوچیں کہ آنے والے معزز مہمان کی خاطر تواضع کے لیے کس قسم کے پکوان تیار کریں۔"

"میرا خیال ہے کہ بریانی بنا لیتے ہیں۔" زرقا نے چاول چنتے ہوئے کہا۔

"میں تو دعائیں دے رہی ہوں کہ بس جلدی سے شربت دیدار نصیب ہو جائے۔ آمین۔" بشریٰ نے کہا ہی تھا۔ کہ اچانک دروازہ کھلا اور مصطفیٰ کمال اندر آ گئے۔

"واہ بھئی۔" بشریٰ مسکرائی۔

"کیا قبولیت کا وقت تھا۔ دعا اتنی جلدی قبول ہو گئی!"

"کیا حال ہے؟ جیومیٹری کی اس مثلث کا؟" وہ تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"ہم ٹھیک ہیں۔" بشریٰ نے جواب دیا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں نا؟ ویسے ہم نے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے کہ اس مثلث کا ٹاپ والا زاویہ کب تک ٹکے گا؟"

"یہ تو مولا کریم ہی بہتر جانتا ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔ "بزرگوں نے تو ہمیں اگلے پھاگن پر ٹرخا دیا ہے۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔"

"اگلا پھاگن کون سا دور ہے۔" بشریٰ نے تسلی دی۔

"یہ تو صرف ہم ہی جانتے ہیں نا کہ کتنی دور ہے۔" مصطفیٰ کمال نے سرد آہ بھری۔

"تو لوگوں کو کیا پروا۔ بس موج کرو۔"

"تو پھر کیا خیال ہے۔" بشریٰ ان کی بات سنتے ہی زارا سے مخاطب ہوئی۔ "علم بغاوت بلند کر دیا جائے؟"

"بالکل۔" زارا شوخ لہجے میں بولی۔ "میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"تو چلو پھر ابھی چل کر بات کرتے ہیں۔" وہ حسب عادت ساتھ لہراتے ہوئے کہنے لگی۔

"پاگل نہ ہو۔" مصطفیٰ کمال نے فوراً ٹوکا۔

"ہم پاگل بنیں گے تو آپ کا کام ہو گا نا بابا۔" بشریٰ نے کہا۔ "ورنہ ساری دنیا تو شادی شدہ ہو جائے گی اور آپ اسی طرح پھرتے رہیں گے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولے۔ "مجھے کچھ عرصے تک آزادی کے ساتھ اسی طرح پھرنے دو۔ اس کے بعد قید بامشقت تو نصیبوں میں لکھی ہی جا چکی ہے۔"

عصر کی نماز سے فارغ ہو کر بی بی جان ادھر ہی آ گئیں۔ اور اس معتبر قسم کی دخل در معقولات کی وجہ سے نوک جھونک کا یہ خوب صورت سلسلہ ختم ہو گیا۔

بشریٰ اور زارا نے بازار جانے کی اجازت چاہی جو فوراً مل گئی۔ جبکہ ماسی میراں بطور گارڈ ساتھ جا رہی تھی۔ مصطفیٰ کمال نے مشرقی پاکستان میں مقیم احباب کی بیگمات اور دیگر اہل خانہ کے لیے تحائف کی خریداری کی مد میں رقم ان کے حوالے کرنا چاہی تو بشریٰ نے فوراً کہا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں بھائی صاحب۔ یہ رقم خطیر ہو یا حقیر۔ ہم بالکل بھی قبول نہیں کریں گے۔ کیا ہم اتنے بے مروت ہیں؟"

پھر بہ مجبوری مصطفیٰ کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری طرف سے تم دونوں اپنے لیے ایک ایک سوٹ لے لینا۔"

"صرف ہم دونوں؟" بشریٰ نے آنکھیں گھمائیں۔ "مگر میری بے چاری کا کیا بنے گا؟"

"اس کے لیے تو ویسے بھی اگلے پھاگن میں جوڑے تیار ہو جائیں گے۔" زارا نے کہا۔

"فی الحال یہ رکھ لو۔ بھائی بہنوں کو دیا کرتے ہیں لیا نہیں کرتے۔" مصطفیٰ کمال نے کچھ رقم زبردستی اسے تھما دی۔ ادھر ان کی بازار کے لیے روانگی ہوئی۔ ادھر بیٹھک سے بلاوا آ گیا۔ اور باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی زرقا نے سوچا۔

"اگلا پھاگن تو بہت دور ہے۔ کہیں دور۔ افق کے اس پار۔" اور دل نے تاکید کی۔ گزرتا ہوا آج بہت قریب اور آنے والا کل بہت دور ہوتا ہے۔ جدائی کے لمحات ایک مرتبہ پھر سامنے تھے۔ فقط ایک کل کا دن ہی تو بیچ میں تھا۔ پھر ایک لمبی اڑان سامنے تھی۔ اور اپنے ہی وطن میں مسافرت کا وہ سفر۔ جو مسافر کے لیے تو ادائیگی فرض تھا۔ لیکن محبوب کے لیے ایک طویل ہجر۔ اور اس ہجر سے اس وصال تک کے درمیان زندگی کے بے شمار پل اور ان گنت گھڑیاں موجود تھیں۔ جنہیں پل پل گزارنا بہت زیادہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن لگ رہا تھا۔

اس وقت شاہ جی کی بیٹھک میں محترم پروفیسر اکرم قریشی صاحب بطور خاص ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ وہ مصطفیٰ کمال سے اس بات پر اظہار افسوس کر رہے تھے کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کے کلاس فیلو اور دوست پروفیسر روشن خیال آخر کیوں کر اپنے ان نظریات پر قائم رہ سکے۔ جن نظریات کے تحت وہ ماضی میں تو برصغیر کی تقسیم کو ایک ایسی اعلا و ارفع حقیقت تسلیم کرتے تھے جس کے بغیر مسلمانان ہند کی بقا ممکن نہ تھی۔ لیکن آج وہ اسے تاریخ کا جبر جانتے ہوئے وطن کے جغرافیے کو یکسر تبدیل کرنے کی پالیسی کو اپنا ایمان اور زندگی کا مقصد سمجھنے لگے تھے۔

اگر یہ ان کی زندگی کا مقصد تھا تو بھلا وہ سب کیا تھا؟ جس کے بارے میں تاریخ گواہ ہے کہ ایک الگ وطن ایک الگ پرچم اور اپنی پہچان کی جدوجہد میں سرزمین بنگال کے بزرگ سب سے آگے تھے؟

کتنی مشکلوں سے ہم منزل تک پہنچے تھے اور اب عین عالم شباب میں بنگال کی سرسراتی ہوئی ہوائیں غیروں کی شہ پر دائمی جدائی کا نوحہ سنانے لگی تھیں۔ اور دشمن اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا وار کرنے کی بھرپور تیاری کر رہا تھا۔ چونکہ اس آگ کی تپش ابھی کچھ فاصلے پر تھی۔ البتہ راکھ میں دبی ہوئی وہ چنگاریاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ جو کسی بھی وقت بھڑک کر شعلہ بن سکتی تھیں۔

نماز مغرب اسی تشویش کی نذر ہو گئی۔ وقت عشاء خاموشی سے در آیا۔ مسجد سے امامت کے لیے بلاوا آیا کہ خطیب صاحب ناسازیٔ طبع کی بنا پر یہ فریضہ سرانجام دینے

سے قاصر تھے۔ شاہ جی کے ہمراہ باقی اراکین مجلس بھی نماز کے لیے تشریف لے گئے اور پھر شاہ جی کی امامت میں اپنے رب کے حضور اپنا فریضہ ادا کرنے کے بعد گڑگڑا کر دعائیں مانگی گئیں' اور کئی رقیق القلب نفوس نے آنسوؤں کا نذرانہ اپنے رب کے حضور پیش کیا کہ وطن کی سلامتی سب ہی کو عزیز تھی' اس لیے کہ یہ امام اور مقتدی عوام تھے حکمران نہیں۔ اور ہر دور کے عوام اپنی نہیں بلکہ وطن کی ہی بہتری چاہتے ہیں۔

مصطفیٰ کمال نے گھر جانے کے لیے قدم بڑھائے لیکن شاہ جی کا ہاتھ ان کے کندھے پر ٹک گیا۔

"چل پتر! مرشد کی جگی چلتے ہیں۔"

آسمان پر گھٹتے ہوئے چاند نے بادلوں کی اوٹ سے نکل کر راستہ روشن کردیا اور اس ہلکی روشنی میں مرشد کی جگی کا فاصلہ تمام ہوگیا۔ مرشد کا مراقبہ بہت طویل اور گہرا تھا۔

وہ بہت دیر سے چپ تھے۔ ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے مرید اور غازی پر ڈالی۔ پھر گویا ہوئے۔

"ہمیں دکھ ہے کہ ہم نے تمہیں گزشتہ ملاقات میں بھی کوئی نوید مسرت نہیں دی اور آج اس وقت بھی ہمارے پاس تمہارے لیے بہتری کی کوئی خبر نہیں۔ مگر مایوس نہ ہونا۔ اپنے کندھوں پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کی لاج رکھنا۔ ہم دعاگو رہیں گے۔"

وہ دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھاتے ہوئے جھک گئے۔ شاہ جی کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر تھی اور لبوں پر مقدس آیات کا ورد جاری تھا۔ رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا اور وقت تہجد قریب تھا۔ اس نے اجازت لینا چاہی۔ لیکن مرشد کسی گہری سوچ میں تھے۔ پھر اچانک ان کی آواز آئی۔

"وہ۔ جنہیں اب جاگ جانا چاہیے۔ تائب ہو جانا چاہیے وہ گہری غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وقت تہجد ان کی محفلیں شباب پر ہیں۔ وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانے ہیں۔ وہ بھول چکے ہیں کہ بالآخر ایک دن انہوں نے اس عالم فانی سے کوچ کر جانا ہے۔ وہ اس وقت کے بادشاہ گر ہیں۔ اور بادشاہ گری کے اس شوق میں یہ بات بھی بھلا بیٹھے ہیں کہ وہ اس سرزمین کے وارث ہیں۔ امین ہیں۔ یہ وہ سرزمین ہے۔ جس کے لیے اکہرے بدن کے ایک کمزور اور ناتواں وکیل نے ساری دنیا کے ساتھ اس کے حصول کے لیے مقدمہ لڑا اور لاکھوں دعاؤں کی قبولیت کے جلو میں اس مقدمے کو اپنی ذہانت اور علمیت کے بل [illegible] لیا۔ لیکن میں آنے والے وقت میں اپنی قوم کو [illegible] کے ایسے حصار میں جکڑا ہوا دیکھ رہا ہوں [illegible] ممکن عمل نہیں۔ شاید تم جہاں ہو۔ وہاں کی ہوائیں [illegible] بدل لیں گی۔ بہت تیز آندھیاں چلیں گی۔ کچھ [illegible] لے۔ کچھ بچھڑ جائیں گے۔" مرشد کی آنکھوں میں [illegible] چمک رہے تھے۔

برسوں سے شاہ جی کا ان کی جگی میں آنا جانا تھا لیکن انہوں نے آج تک انہیں روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بہت دیر بعد ان کی آواز آئی "اتحاد وقت کی ضرورت ہے۔ ان شاء اللہ ہم سرخرو رہنے کی امید رکھتے ہیں۔ آپ لوگ غازی ہیں۔ اور ہم آپ کی عظمت اور عقیدت کو سلام پیش کرتے ہیں۔"

یکایک وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور با آواز بلند بولے

"حالات کے قدموں میں قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی ستارہ جائے تو زمیں پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بہت شوق سے دریا
لیکن کبھی دریا میں سمندر نہیں گرتا"

مرشد مسکرائے اور جانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

شاہ جی نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور جب مصطفیٰ کمال نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرنا چاہا تو مرشد ایک قدم پیچھے ہٹے اور پھر زبردست فوجی انداز میں مصطفیٰ کمال کو سلیوٹ کیا۔ یہ ایک غازی کی خدمت میں ان کی طرف سے عقیدت کا اظہار تھا۔ اظہار تشکر کے طور پر اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

رات اب گزر چکی تھی اور صبح کے آثار قریب تھے۔

"جاؤ۔ کچھ دیر آرام کرلو۔" شاہ جی نے کہا۔

"یاد رہے فجر قضا نہ کرنا۔" انہوں نے تاکید کی۔

"جی بہتر۔" وہ بیٹھک کی اندرونی سمت سے اندر آئے تو سامنے باورچی خانے کا بلب روشن تھا۔ اور اپنے گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے وہ وجود اس کا منتظر تھا۔ جس نے ان کی ہر قدر پر اپنے خوابوں کی تعبیر پانا چاہی۔ لیکن ہر مرتبہ بات اگلے چاند تک دور چلی گئی۔

اس نے سیڑھیاں طے کرنے کے لیے قدم بڑھائے لیکن آنکھیں ان سماعتوں سے ٹکرا چکی تھیں۔ جو رات بھر سے انتظار کے عالم میں کچھ سوتی کچھ جاگتی راہ تک رہی تھیں۔

[illegible] باورچی خانے کے دروازے میں آن رکا۔

"[illegible] جاگ رہی ہیں؟" سوال کیا گیا۔

بہت دیر کے بعد جواب ملا۔

"[illegible] کیوں؟" یہ سوال بے معنی تھا کہ اس کا احساس [illegible] ہوا۔

"آپ کا انتظار کررہی تھی۔" نہایت سادگی سے [illegible] کیا گیا۔

"شکریہ۔" اپنائیت کے ساتھ کہا گیا۔

"بیٹھک میں کھانا بھجوادوں؟" آہستگی سے پوچھا گیا۔

"نہیں۔" اس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ جہاں سپیدہ سحر جلو میں روشنی کی نوید لیے ہوئے نمودار ہو رہا تھا۔

"بہت دیر ہوگئی۔ اباجی تو [illegible] تشریف لے گئے ہیں۔"

"اور آپ...؟" رضامندی پوچھی گئی۔

"اب تو وقت ہی نہیں رہا۔ چلیں زندگی رہی تو کل"

"ٹھیک ہے۔" سعادت مندی سے جواب دیا گیا۔

قدم سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپری چوبارے تک چلے آئے۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد نیند کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

صبح روشن اور مہربان تھی۔ جب سوئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چائے پیتی ہوئی زرقا سے بشریٰ نے پوچھا۔

"ذرا اپنے من مندر کے دیوتا سے یہ تو پوچھیں کہ وہ رات بھر کہاں غائب تھے؟"

"میں کس طرح پوچھوں؟" کم گو زرقا صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"فوری طور پر ریمانڈ لے کر تھانے داروں کی طرح تفتیش کریں۔ یا پھر وکیلوں کی طرح جرح۔ کہ بی لالہ پہلے آپ یہ بات تو بتائیں کہ اہل خانہ سے ملاقات کے بہانے آنے کے بعد آپ کو اس طرح رات بھر غائب رہنے کا حق کس نے دیا ہے؟" بشریٰ نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ وہ کہاں گئے تھے۔" زارا نے کہا۔

"جلدی بتاؤ۔ کہاں گئے تھے؟" بشریٰ نے بے تابی سے پوچھا۔

"چچا جان محترم کے ساتھ۔ مرشد کی جگی میں۔" اس نے جواب دیا تو بشریٰ نے حیرت سے سوال کیا۔

"وہ بھلا وہاں کیا لینے گئے تھے؟ وہ حضرت تو ایسی مایوس کن اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں کہ کبھی کبھار تو خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تم تو بلاوجہ ہی ان سے چڑتی ہو۔" زرقا نے کہا۔

"بلاوجہ نہیں چڑتی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"اس کی وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ تین سال قبل انہوں نے میرے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ اگلے چھتیس ماہ کے اندر اندر اس کے ہاتھ پیلے ہوجائیں گے۔ آج چھتیس ماہ سے اوپر دو دن ہوچکے ہیں۔ ابھی تک من کی مراد نہیں ملی۔ چھوڑو یار! یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔"

بشریٰ نے اپنا دکھ بیان کیا تو زارا نے تشویش سے سر ہلایا۔

"بے چارہ بریانی کا دیگچہ۔" اس نے اشارہ کیا۔ "ساری رات انتظار کرتا رہا۔ مگر کھانے والے نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔ اس قدر چاہت اور محبت کے ساتھ پکائی گئی بریانی کی اتنی زبردست توہین...؟" وہ زرقا سے مخاطب ہوئی۔

"اگر میں آپ کی جگہ ہوتی نا، تو احتجاج کے طور پر اس وقت تک بریانی کے دیگچے کو صحن کے بیچ میں الٹ چکی ہوتی۔"

"سوری۔" زرقا نے مدھم لہجے میں کہا۔ "میں ایسی بدتمیزی نہیں کرسکتی۔"

"اگر آپ ایسا نہیں کرسکتیں تو پھر میری پیش گوئی ہے کہ ازدواجی زندگی کے محاذ پر آپ کا مستقبل نہایت تاریک ہے۔ کیا آپ کو ابھی بھی نہیں معلوم کہ ازدواجی زندگی میں چار چاند لگانے کے لیے بیویوں کو اس قسم کی بدتمیزی کرنی پڑتی ہے تاکہ شوہر نامدار کو رات بھر غائب رہنے کی سزا دی جاسکے۔ خدا جانے آپ کا کیا بنے گا؟" بشریٰ نے حسب عادت لمبی تقریر کی۔

"آج شام ان کے پاپا کی روانگی ہے۔" زارا نے بتایا۔ "چلو ان کے لیے ناشتہ بناتے ہیں۔"

"اطلاعاً" عرض ہے کہ یہ ناشتے کا نہیں بلکہ کھانے کا وقت ہے۔ بھئی کوئی حال نہیں۔ ان لوگوں کا۔ بارہ بجے تو سو کر اٹھتے ہیں۔ لڑیں گے کس وقت؟" بشریٰ نے زرقا کی طرف دیکھا۔

"بے چارے چھٹی آنے پر ہی سوتے ہیں۔" اس نے ماہر وکیل صفائی کی طرح جواب دیا۔ "ویسے تو صبح سویرے

"اوور پریڈ" ہوتے ہیں۔"
"واہ۔ واہ۔" بشریٰ نے تالی بجائی۔ "آپ نے تو ابھی سے فوج کی زبان بولنی شروع کر دی۔ آگے پتا نہیں کہ کیا ہو گا؟"
"آگے کا مجھے پتا ہے کہ کیا ہو گا۔" زارا نے کہا۔
"کیا ہو گا؟" بشریٰ نے تجسس سے پوچھا۔
"یہی کہ ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات میں بطورِ خاص لکھا جائے گا۔ کہ فوجی افسروں کے لیے خاص رعایت۔"
"اس میدان میں تو یہ پہلے ہی خود کفیل ہیں۔" بشریٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج کل کے اکثر میزبان یہ عظیم الشان شعبہ اسی لیے منتخب کرتے ہیں۔ تاکہ رشتہ ملنے میں آسانی رہے۔"
"اور آسانی رہتی بھی ہے۔" زارا نے کہا۔
"لوگ مطمئن ہو کر "ہاں" کر دیتے ہیں۔"
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" زرقا نے لقمہ دیا۔
"ہم آپ کی نہیں۔ باقی دنیا کی بات کر رہے ہیں۔"
"اب ساری دنیا ہمارے بزرگوں کی طرح تو نہیں ہوتی ناں کہ اولاد کے تمام تر احساسات اور جذبات سے بے نیاز ہو کر بچاگن پر بچاگن کی تاریخ ڈالتی جائے۔"
بشریٰ اپنی ہی رو میں کہتی چلی گئی اور جب نظر دروازے پر پڑی تو زبان کو بریک لگ گیا۔ مصطفیٰ کمال بالکل سامنے ہی تو کھڑا تھا۔
"کیا آج۔ ناشتہ نہیں ملے گا۔" اس نے پوچھا اور بشریٰ کی زبان پھر چل پڑی۔
"فوج کے سنہری اصولوں کے مطابق بہت ممکن ہے کہ یہ ناشتے کا وقت ہو لیکن ہم جیسے غریب، یتیم اور مسکین سویلین کے کچھ بے معنی اصولوں کے مطابق اس وقت کھانا کھایا جاتا ہے۔"
مصطفیٰ کمال کچھ نہ بولا۔ مسکراتا رہا۔ زارا کہہ رہی تھی۔
"ناشتے میں آپ کو رات کی بچی ہوئی باسی بریانی پیش کی جائے گی۔ ویسے کتنی اچھی بات ہوتی بھائی! اگر آپ اس مرتبہ اپنے خانساماں کو بھی ساتھ لے جاتے۔" اس نے زرقا کی طرف اشارہ کیا۔ جو دروازے کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ اور کشمیری چائے کے لیے سبز پتی کا رنگ نکالنے کے لیے قہوہ پھینٹ رہی تھی۔
مصطفیٰ کمال نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اب ماسی میراں، ختے کی زبانی بیٹھک سے آیا ہوا پیام نشر کر رہی تھی۔ جس کے مطابق فیقا پہلوان ان سے ملاقات کے لیے بیٹھک میں تشریف فرما تھے اور اپنی آمد کے ساتھ ہی انہوں نے برادرم مصطفیٰ کمال کی غیر موجودگی میں سہرے کی لڑیاں سجانے سے یکسر انکار کرتے ہوئے بیک وقت ختے اور ماسی میراں کا دل توڑ کر پاش پاش کر دیا تھا اور ماسی میراں بی بی جان کی خدمت میں اس صدی کا یہ دردناک مقدمہ دائر کرنے کے بعد التجا کر رہی تھی۔
"اسے سمجھائیں جی۔" اس کا اشارہ فیقے کی طرف تھا۔ "اپنی ضد کا بڑا پکا ہے۔ میں کیا کروں گی بی بی جی! میرے ختے تو بیٹھی بیٹھی بڈھی ہو جائے گی۔"
"فکر نہ کر ماسی!" زارا نے تسلی دی۔
"ہم ختے کو بھائی صاحب کی واپسی تک بیٹھنے ہی نہیں دیں گے۔ اگر وہ کھڑی ہی رہی ناں تو امید ہے کہ بڈھی نہیں ہو گی۔"
"اب آپ مخول (مذاق) نہ کریں جی۔" ماسی میراں شاید برا مان گئی۔
"ویسے مجھے تو آج تک میجر صاحب اور فیقے کی دوستی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔"
"سمجھ میں تو مجھے بھی نہیں آیا۔" زارا نے اعتراف کیا۔
"ماسوائے اس کے کہ دونوں بچپن کی ہم جولیاں ہیں۔"
"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے۔ کہ "ہم جولیاں" کی اصطلاح لڑکیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ لڑکوں کے لیے نہیں۔"
"اچھا۔ اچھا۔" زارا کہنے لگی۔ "دراصل مجھے تو خیال ہی نہ رہا کہ میں اس وقت صنفِ قوی کی بات کر رہی ہوں صنفِ نازک کی نہیں۔"
ناشتہ سجا کر بیٹھک روانہ کرنے سے پہلے بشریٰ نے کہا۔
"میرا خیال ہے۔ ہمیں اس پر کچھ پڑھ کر دم کر دینا چاہیے تاکہ بھائی کے ساتھ ساتھ فیقے کا کام بھی بن جائے۔"
"تیرے دم درود سے کام چلتا ناں تو تُو اس وقت اپنے سسرال میں بیٹھی ہوتی۔ یہاں موجود ہمارا دماغ نہ چاٹ رہی ہوتی۔" زارا نے جتایا۔
"ایسی اپنی ایسی قسمت کہاں؟" اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "یہاں تو مرشد کی دعا راس نہ آئی۔ اپنے دم درود سے بھلا کیا بنے گا؟"
اچانک دونوں نے محسوس کیا کہ زرقا بہت دیر سے خاموش ہے اور ان کی تمام تر گفتگو اس کے دوران کسی بھی قسم کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کر رہی۔
"باجی! آپ اداس ہیں؟" زارا نے پوچھا۔
"نہیں۔ میں ناراض ہوں۔" اس نے جواب دیا۔
"مگر کیوں؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔
"تم نے مجھے خانساماں کیوں کہا؟" اس نے بشریٰ سے پوچھا۔
"یہ تو آپ شکر کریں کہ میں نے آپ کو خانساماں کہا۔ ورنہ فوج میں تو اسے مسالچی کہا جاتا ہے۔" بشریٰ نے کہا۔
"تمہیں کیسے پتا؟" زارا نے پوچھا۔
"بھئی۔ میں نے کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" میں پڑھا تھا۔" اس نے اپنی علمیت بگھاری۔
"وہ زمانہ اور تھا۔" زارا نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔
"آج کل تو کک کہا جاتا ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مسالچی، برتن دھونے والے کو کہا جاتا ہے۔"
"تمہیں کیسے پتا ہے۔" بشریٰ نے پلٹ کر اس کا سوال دہرایا۔
"یہ میں نے بھی اسی کتاب میں پڑھا ہے۔ جس میں سے تم پڑھ کر اپنی علمیت ثابت کرتے ہوئے اب ہمیں جاہل مطلق ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"
اچانک مصطفیٰ کمال اندرونی صحن کی طرف آ گئے۔
"آپ لوگوں نے پیکنگ مکمل کر لی۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔
"آپ کے دوست احباب کے لیے نذرانے تیار کیے ہیں۔ امید ہے انہیں ضرور پسند آئیں گے۔"
"بہت بہت شکریہ۔" اس نے ممنونیت سے کہا۔
پھر چند لمحوں بعد گویا ہوا۔ "عصر کے بعد میری روانگی ہے۔" اس نے اطلاع دی۔
"بہت کم وقت باقی رہ گیا ہے۔" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ "مجھے تیاری بھی کرنی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اوپری چوبارے کی طرف بڑھ گیا۔
اداسیوں کے سائے صحن میں پھیل گئے کہ اب وقتِ رخصت قریب تھا۔ شاہ جی بیٹھک سے اندر آ گئے۔ ان کا چہرہ آزردہ دکھائی دے رہا تھا۔ بی بی جان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بار بار سفید آنچل سے اپنا چہرہ صاف کر رہی تھیں۔
بے حد چہکتی ہوئی بشریٰ خاموش تھی اور وقتِ عصر کی آمد سے پہلے ہی زارا نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجالی تھیں۔ ماسی میراں اور ختے مایوس کن کیفیت میں نظر آ رہی تھیں اور باہر اہل محلہ کے ساتھ موجود فیقے نے دھاڑیں مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔
مصطفیٰ کمال اوپری چوبارے سے نیچے آیا اور اس قدر سناہٹ کا سماں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔
"بھئی یہ آپ سب کو کیا ہو گیا ہے؟" انہوں نے بشریٰ سے کہا تھا اور ہر بات کا "فوراً" جواب دینے والی بشریٰ خاموش رہی۔
"ان شاء اللہ میں لوٹ آؤں گا۔" اس نے تسلی دی۔
"اگلے پچاگن سے بہت پہلے۔"
اس نے بڑا بھائی ہونے کے ناطے زارا اور بشریٰ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر زرقا کی طرف دیکھ کر بولا۔
"تمہاری یاد میرے ساتھ رہے گی۔"
آنسو چھما چھم برسنے لگے مصطفیٰ کمال شاہ جی کے سینے سے لگ کر الگ ہوتے بی بی جان کی دعاؤں کے سائے میں دروازے سے باہر نکلا پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شاہ جی کی آنکھیں نم اور ہونٹ کانپتے رہے۔ گویا کہنا چاہتے ہوں۔
مغرب سے پہلے گھر واپس آ جانا۔
زمانۂ طالب علمی میں جب بھی وہ گھر سے باہر جاتا وہ "تاکیداً" کہتے۔
"مغرب سے پہلے گھر واپس آ جانا۔" لیکن آج تو عصر اور مغرب کے درمیان فاصلہ ہی بہت کم تھا۔ بہت ہی کم کہ رخصت ہونے والے کی جدائی نے یہ فاصلہ مٹا دیا تھا۔
شام خاموشی کے ساتھ صحن میں اتری۔ باورچی خانے میں روشنی بہت کم تھی۔ شاہ جی کی بیٹھک سنسان اور اوپری چوبارہ خاموش تھا۔ اپنے اپنے دلوں کے اندر آزردگی کا اک جہان لیے ہوئے سب ہی نفوس چپ اور گم صم تھے۔
پھر۔ ایک آہٹ ابھری اور دو قدم خاموشی اور آہستگی سے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپری چوبارے تک پہنچ گئے۔

سامنے بالکنی میں باریک چاند روشن تھا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک بندھی ہوئی رسی پر پڑا ہوا گلابی اور سفید لکیروں والا تولیہ ہلکی ہوا کے سنگ جھول رہا تھا۔ متجسس نظروں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سفید تکیے کے نیچے رکھے گئے سفید کاغذ پر تحریر تھا۔

"نہ جانے کیوں؟ اس مرتبہ آنے والا اگلا پھاگن دور بہت دور دکھائی دے رہا ہے۔ ہم تو چاہت کی تمنا میں امیدوں کا سفر طے کرکے آئے تھے۔ لیکن ہجر کے لمحوں نے طوالت اختیار کرلی۔ بہرحال میں مایوس نہیں ہوں۔ میرے وطن میں جب اگلا پھاگن آئے گا۔ کھیتوں میں سرسوں کے زرد پھول کھلیں گے تو میں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی آس لیے لوٹ آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔"

نیلی روشنائی سے لکھے گئے لفظ آنسوؤں میں بہہ گئے اور ہجر کی سیاہ رات دھیرے دھیرے چھاگئی۔

جدائی کے ان لمحوں میں آنکھیں روتے روتے نہ جانے کب سو گئیں۔



ڈھاکہ کے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور مغربی پاکستان سے آنے والی پرواز چالیس منٹ لیٹ تھی۔ ایئرپورٹ پر منتظر میزبان بے چین تھے کہ انتظار کی یہ گھڑیاں بہت طویل ہو چکی تھیں۔

ہجر اور وصال کی درمیانی خلیج ختم ہو چکی تھی اور آج اس وقت اس پرواز سے میجر حسن امام اپنی دلہن منزہ میر علی کے ہمراہ مشرقی پاکستان آ رہے تھے۔ وہ منزہ میر علی جسے جذبے کی سچائیوں نے مسز منزہ حسن امام کا نام عطا کردیا تھا اور جس نے زندگی کا یہ رنگ انتہائی خوش دلی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اب گھر گرہستی کا خوش کن روپ اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ رسم نکاح کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے اپنا استعفیٰ صدیقی صاحب کے حضور پیش کردیا تھا!

کومیلا سے کرنل سلطان کیانی بمعہ بیگم نور سلطان تشریف لائے تھے اور گزشتہ روز سے میس میں قیام پذیر تھے۔ اگرچہ شاہ نوید کی موجودہ رہائش گاہ ڈھاکہ میں موجود تھی۔

تاہم اپنے علاقے کی روایات اور وضع داری کے سبب بیٹی کے گھر قیام کچھ زیادہ اچھی بات تصور نہیں کی جاتی تھی۔ اس وقت شاہ بھی اپنے شوہر نوید باری کے ہمراہ حسن امام اور منزہ کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھی اور اپنی والدہ سے محو گفتگو تھی۔

میجر تمکین تاج اور جھرنا بھابی اپنے ہاتھوں میں ہار پھول لیے ان کے منتظر تھے۔ کیپٹن شاہ پال کے ساتھ ڈاکٹر پیاء بھی آئی تھیں۔ مصطفیٰ کمال نے معزز مہمانوں کی آمد سے پہلے ہی اسٹیشن ہیڈ کوارٹر سے خصوصی اجازت کے بعد پرت روڈ پر بنگلہ لینے کے بعد ایم۔ ای۔ ایس سے فرنیچر حاصل کرکے اس مکان کو ایک بہترین گھر کی شکل میں ڈھال دیا تھا۔

لیکن اس نوبیاہتا جوڑے کے لیے جھرنا بھابی نے اپنے گھر کے گیسٹ روم میں خصوصی سیج سجائی تھی اور ارادہ بھی یہی تھا کہ کم از کم دو ماہ تک انہیں شرف میزبانی بخشنے کی استدعا کی جائے گی۔

ان کے اعزاز میں شاہ نوید نے لنچ کا انتظام کیا تھا۔ جبکہ رات ڈنر کے لیے قمرالدین قاضی صاحب کی طرف سے دعوت تھی۔ کہ یہ ڈاکٹر پیاء کی خواہش تھی۔ جس کے احترام میں قاضی صاحب اپنے فرزند ارجمند کی مخالفت کے باوجود انکار نہ کرپائے تھے۔

پی آئی اے کا طیارہ فضا سے زمین پر اتر آیا۔ پہیوں نے سرزمین بنگال کو چھوا اور منتظر احباب آگے بڑھے۔ مسافر اترے۔ آگے بڑھے اور اپنوں نے انہیں گلے لگالیا۔ کچھ سہمی کچھ گھبرائی ہوئی منزہ حسن امام کے سنگ چلتی آگے بڑھی۔

کس قدر محبت سے جھرنا نے اسے "میری بہن" کہتے ہوئے گلے سے لگایا تھا۔

"اور آپا کیسی ہیں آپ۔" ہمہ کر پیاء نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ مصطفیٰ کمال نے پھولوں کا ہار حسن امام کے گلے میں ڈالتے ہوئے منزہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس جیت کی خوشی میں یہ ہار مبارک ہو۔" سب لوگ بے ساختہ مسکرادیے۔ بلاشبہ مصطفیٰ کمال روتوں کو ہنسانے کا فن بخوبی جانتا تھا۔ کرنل سلطان کیانی نے کمال شفقت کے ساتھ منزہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بیگم نور سلطان نے دعاؤں کے ساتھ استقبال کیا۔ اور اس قدر محبت خلوص اور پذیرائی کے اس ماحول کو پاکر منزہ حسن امام کی آنکھیں بھیگ گئیں دل سے بے ساختہ آواز آئی۔

"کون کہتا ہے؟ کہ بنگال اب بدل چکا۔ وہاں شورش اپنا سر ابھار رہی ہے۔ بغاوت کے بیج بوئے جارہے ہیں۔ سوچ کسی اور سمت جارہی ہے۔ حالات بدل رہے ہیں۔ ہر گز نہیں۔ یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں۔ کہیں بھی نہیں۔ زندگی ایک بہترین تناسب کے ساتھ رواں دواں ہے۔ کہیں کسی جگہ کچھ بھی تو برا نہیں۔ محبت اور بھائی چارے کی فضا قائم ہے۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان بڑے اور چھوٹے بھائیوں کی طرح ہیں۔ یہ ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ جس دیس کے باسی میجر تمکین تاج، جھرنا بھابی اور ڈاکٹر پیاء جیسے مخلص افراد ہوں۔ وہاں کے ملکی بھر علیحدگی پسند عناصر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ان شاء اللہ کبھی نہیں۔"

اس سرزمین پر اپنی آمد کے ساتھ ہی منزہ حسن امام کا دل بے حد مطمئن ہوگیا۔ گاڑیوں کا قافلہ اب ایئرپورٹ سے "باری ہاؤس" کی طرف رواں دواں تھا۔

ڈھاکہ کی سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی اور ہر طرف سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔

"اور کیا حالات ہیں؟" حسن امام نے پوچھا۔

"کچھ نہ پوچھو یار!" مصطفیٰ کمال نے جواب دیا۔

"میں تو ویسٹ پاکستان گیا تھا۔ تمہارا سہرا سجوانے۔ لیکن یہاں تو اپنا ہی باجا بج گیا۔ بریگیڈیئر سراج نے نادر محی الدین کے بے جا مشورے پر استعفیٰ دے دیا۔ ہر طرف گویا کہ کھلبلی مچ گئی۔ اب اطلاعاً عرض ہے کہ بریگیڈیئر سراج تو جاچکے اور مغربی پاکستان سے بریگیڈیئر خلیل الرحمن شعلہ کی آمد ہوچکی ہے۔ موصوف کو تو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ لہٰذا اب ان کی موجودگی میں ہمیں سانس بھی احتیاط سے لینا ہوگی۔"

"بریگیڈیئر سراج کا موڈ کیسا تھا؟" حسن امام نے پوچھا۔

"بے حد خراب۔" مصطفیٰ کمال نے جواب دیا۔

"سب سے زیادہ تو تم پر بھڑکے ہوئے تھے کہ ان پر اتنا زیادہ برا وقت آچکا تھا اور تم ڈھول تاشے پیٹ رہے تھے۔ یار کم از کم انسان کو اتنا خود غرض بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"بڑی مشکل سے تو ڈھول نصیب ہوا ہے۔" حسن امام نے کہا۔

"اب دوسروں کی خاطر میں اپنی خوشیاں برباد کرنے سے تو رہا۔"

"اچھا۔ تو کیا ان "دوسروں" میں ہمارا شمار بھی ہوگا!"

"نہیں بھئی۔ تمہاری بات "دوسری" ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ ہماری بات اب "دوسری" ہی ہوگی۔ پہلی بات تو یقیناً بھابی صاحب کی ہوگی۔" مصطفیٰ کمال نے چھیڑا۔

"سر کل اس ویک اینڈ پر قمرالدین قاضی صاحب نے کھانے پر بلایا ہے۔" کیپٹن شاہ پال نے یاد دلایا۔

"ہاں۔ یار دعوت تو ملی ہے۔ اور میں اس وقت سے شرمندہ ہوں۔"

"کس سے؟" حسن امام نے پوچھا۔

"اپنے آپ سے اور کس سے؟" مصطفیٰ کمال نے جواب دیا۔

"معاف کرنا یار!" اس نے کیپٹن شاہ پال کو مخاطب کیا۔

"میں تو خوامخواہ ہی تمہیں ان کے ہاں جانے پر ٹوکتا رہا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اتنے اچھے آدمی ہیں۔"

"جی سر!" کیپٹن شاہ پال نے تائید کی۔

"ان کے نزدیک کسی آدمی کے اچھے ہونے کا معیار یہی ہے۔ کہ وہ انہیں دعوت پر ضرور بلائے۔" حسن امام نے کہا۔

"میں کھانے پینے شہر گوجرانوالہ کا باسی ہوں۔ ظاہر ہے دعوت میری کمزوری ہے۔ چاہے یہ دعوت شیرازی کیوں نہ ہو۔" مصطفیٰ کمال مسکرایا۔

گاڑیوں کا قافلہ "باری ہاؤس" کے سامنے رک چکا تھا۔ بہت دیر کے بعد گیٹ کھلا اور بجری کی طویل روش طے کرنے کے بعد مہمانوں کی گاڑیاں آن رکیں۔ توقع تو تھی کہ مسز زینت باری انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے باہر آمدے میں تشریف لائیں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاہ اور نوید باری مہمانوں کو لے کر اندر کی جانب گئے اور اندرونی گیلری میں پہنچتے ہی کرنل سلطان کیانی ایک حیرت اور افسوس کے عالم میں ٹھٹک کر کھڑے ہوگئے وہ جگہ۔ جہاں حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر آویزاں تھی اور جسے دیکھ کر کرنل سلطان کیانی نے اپنی لخت جگر کے نصیب اس گھر سے جوڑنے کا فوری طور پر فیصلہ کیا تھا۔ اب اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی۔ اور وہاں اس عظیم تصویر کی بجائے نادر محی الدین کی تصویر مسکرا رہی تھی وہ حیران رہ گئے۔ کیا مماثلت تھی بھلا دونوں کے درمیاں؟ ایک بکھرے ہوئے خوابوں کو سمیٹ کر ایک منزل ایک مرکز کی شکل دینے والا محسن اور دوسرا ان سمیٹے

ہوئے خوابوں کو توڑ کر بکھیر کر شیشے کی کرچیوں کا روپ دینے کے بارے میں سوچنے اور عمل کرنے والا ایسا سیاست دان جو قوم کے قدموں میں صرف یہ کرچیاں ہی نہیں بلکہ سنگ ریزے اور کانٹے بچھانے کا عزم بھی رکھتا ہو اور اپنے اس کارنامے پر شرم سار ہونے کی بجائے فخر محسوس کرتا ہو۔

کرنل سلطان نے اپنے سوال کا جواب پانے کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب مہمان اندر ڈرائنگ روم میں جا چکے تھے۔ اچانک ثناء گیلری میں چلی آئی۔

"آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں ابو جی؟ اندر آئیے نا۔"

"ثناء!" انہوں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"یہاں سے حضرت قائداعظم کی تصویر کس نے اتاری؟"

"کون سی تصویر ابو جی؟" ثناء نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ "میں تو یہاں اپنی آمد کے بعد پہلے دن سے ہی نادر ماموں کی تصویر آویزاں دیکھ رہی ہوں۔" ثناء کا جواب مزید حیران کن تھا۔

"جب ہم تمہارے رشتے سے پہلے یہاں آئے تھے تو یہاں حضرت قائداعظم کی تصویر آویزاں تھی اور اس تصویر کو دیکھ کر ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ یقیناً میری بیٹی اس وطن پرست گھرانے کی بہو بن سکتی ہے۔"

ثناء کچھ نہ بولی۔ خاموش کھڑی اپنے باپ کی بات سنتی رہی۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھری اور مسز نزہت باری کا سراپا سامنے آگیا۔

"ویلکم بھائی صاحب!" انہوں نے بادل نخواستہ کہا۔

"آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" انہوں نے سوال کیا۔

"بہن جی!" کرنل سلطان نے حد ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا۔

"جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو اس جگہ حضرت قائداعظم کی تصویر آویزاں تھی لیکن آج یہ جگہ خالی کیوں ہے؟"

مسز نزہت باری کو اپنے سمدھی سے اس سوال کی قطعی امید نہ تھی۔ انہوں نے تقریباً چونکتے ہوئے ایک قہر آلود نظر ان کے قریب کھڑی ثناء پر ڈالی اور پھر نہایت تیکھے انداز میں بولیں۔

"یہ تو وقت وقت کی بات ہے بھائی صاحب اور گزرتے وقت کے ساتھ جگہیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ آپ کی بیٹی اس گھر میں بہو ہے۔ لہٰذا آپ کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ کس کی تصویر کیوں اور کب ہٹا دی گئی۔"

غصے کا اِک طوفان کرنل سلطان کیانی کے اعصاب پر چھا گیا۔ لیکن وہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

"وہ کسی عام انسان کی تصویر نہیں تھی بہن جی! اس تصویر کا جگہ بدلنا نہایت اہم معنی رکھتا ہے۔"

"میں اس وقت کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔" مسز نزہت باری کسی قدر زہریلے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"بہتر یہی ہے کہ آپ اس بات کو ایشو بنائے بغیر مہمانوں میں شامل ہو جائیں۔ ورنہ حالات ناخوشگوار رخ بھی اختیار کرسکتے ہیں اور ویسے بھی یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔"

"یہ آپ کا ذاتی معاملہ نہیں۔ بلکہ ہمارا قومی معاملہ ہے۔" کرنل سلطان کیانی نے کہا۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے اس مقدس شبیہ پر اپنی بیٹی قربان کردی ہے۔"

"واہ۔ کیا زبردست قربانی ہے۔" وہ تلملا کر بولیں۔

"کیا آپ کے ہاں ویسٹ پاکستان میں گھر گھر یہ تصویر سجی ہوئی ہے۔ کیا وہاں جس گھر میں یہ تصویر نہیں۔ وہاں کوئی رشتہ طے نہیں ہوتا؟"

"ایسٹ پاکستان ہو۔ یا پھر ویسٹ پاکستان۔" کرنل سلطان کیانی نے کہا۔

"یہ تصویر تو ہر پاکستانی کے دل میں سجی ہوئی ہے۔ زندہ قومیں اپنے محسن کو بھلایا نہیں کرتیں اپنے رب کے بعد اس کی پوجا کرتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بات کو یہیں ختم کردینا چاہیے۔" مسز نزہت باری نے لاجواب ہو کر کہا۔

"مجھے امید ہے کہ آپ اپنی بیٹی کو ہمیشہ خوش دیکھنا پسند کریں گے۔"

خاموش اور آزردہ کرنل سلطان کیانی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے مصنوعی انداز میں تکلف کے ساتھ مسز نزہت باری کو ہر مہمان سے ملتے ہوئے دیکھا۔

یہ وہ خاتون تھی۔ جس نے اس رشتے کے لیے کتنی منتیں کی تھیں اور آج ان کی زبان ہی نہیں بلکہ ہر انداز بھی اجنبی اور لاتعلق ہو چکا تھا۔

"سر! آپ چاول لیجیے نا۔" ڈاکٹر ریاء نے چاولوں کی ڈش ان کی طرف بڑھائی۔

"ہمارے ہاں کا چاول بے حد لذیذ ہوتا ہے۔ پٹ سن کی طرح ویسٹ پاکستان والوں کی اس پر بھی جان جاتی ہے۔ دیکھیے تو سہی۔ ان چاولوں کا رنگ کتنا سفید ہے۔"

نزہت باری کی گفتگو کا رنگ نہایت تیکھا تھا۔ اور اس محفل کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کا فریضہ بخوبی سرانجام دے رہا تھا۔ کرنل سلطان کیانی نے سوچا۔

"شاید اب یہاں کے باسیوں کا خون بھی اپنے چاولوں کی طرح سفید ہونے لگا ہے کہ چند خود ساختہ انقلاب پسندوں کا جادو خوب سر چڑھ کر بولنے لگا ہے اور اب تقدیر کی تختی پر لکھا گیا صاف نظر آرہا ہے۔"

انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن خاموش ہوگئے۔ نادر محی الدین ڈرائنگ روم میں داخل ہورہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں چند اخبارات تھے اور چہرے پر عجب قسم کے تناؤ کی کیفیت تھی۔ انہیں دیکھ کر مسز نزہت باری نے کچھ کہنا چاہا کہ اچانک نوید باری نے بنگالی زبان میں انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا۔ جواب میں انہوں نے غصے سے جو کچھ کہا۔ کیپٹن شاہ پال کے کیے گئے ترجمے کے مطابق اس کا خلاصہ یہ بنتا تھا کہ۔

"سسرال والوں کی بے جا حمایت کرتے ہوئے یہ بات مت بھولو کہ میں تمہاری ماں ہوں۔"

جھرنا بھابی نے بمشکل تمام بات سنبھالی ورنہ اچھی خاصی بدمزگی کا سماں پیدا ہوچلا تھا۔ چنانچہ اب یہ بات طے شدہ انداز میں سامنے آچکی تھی کہ اس محفل کا اہتمام مسز نزہت باری کی مرضی کے خلاف کیا گیا تھا۔

نادر محی الدین نے مغربی پاکستان سے شائع ہونے والا ایک اخبار سامنے پھیلایا اور اس میں شائع شدہ ایک خبر پر تبصرہ کرنے لگے۔

خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دینے کے تحت انہی دنوں ریڈیو پاکستان نے مغربی پاکستان کو "پچھمی پاکستان" اور مشرقی پاکستان کو "پوربی پاکستان" کہنا شروع کردیا تھا۔ اس اخبار میں اس وقت کے ایک نہایت مشہور و معروف کارٹونسٹ کا بنایا ہوا ایک کارٹون شائع ہوا تھا۔ جس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک اسکول ماسٹر صاحب اپنے ایک طالب علم کو ڈنڈا مار رہے ہیں اور وہ طالب علم روتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

"ماسٹر صاحب! ریڈیو پاکستان مغربی پاکستان کو "پچھمی پاکستان" کہتا ہے۔ اگر میں نے مغرب کی نماز کو "پچھم کی نماز" کہہ دیا تو آپ نے مجھے کیوں مارا؟" زندہ دلوں کے لیے تو اس کارٹون میں ہلکے پھلکے مزاح کا عنصر موجود تھا لیکن انتہا پسندوں نے اسے بھی علیحدگی کی تحریک سے وابستہ ایک کڑی بنا کر یہ تاثر دیا کہ مغربی پاکستان میں بنگلہ زبان کی تضحیک کی جارہی ہے۔ اور اب اس محفل میں شریک معزز مہمانوں کو اپنے "حاضرین" کا رنگ دے کر سیاسی بیانات جاری کرتے ہوئے فرما رہے تھے۔

"مغربی پاکستان والے ہمارا دل دکھانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اب یہی دیکھ لیجیے۔" انہوں نے اخبار سامنے پھیلایا۔

"اس قسم کے کارٹون شائع کرنے کا بھلا کیا جواز بنتا ہے؟"

"آپ بھول رہے ہیں کہ اس ضمن میں پہل ہماری طرف سے کی گئی ہے۔" میجر تمکین تاج نے صاف گوئی سے کہا۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ چند ماہ پہلے ڈھاکہ کی ایک ثقافتی تقریب میں اداکار رحمن نے اردو زبان کے بارے میں کس قسم کا بیان دیا تھا۔ کیا اس وقت کسی کو خیال نہیں آیا کہ ایسا کہنا ایک غلط اور قابل اعتراض بات ہے۔ بے جا تنقید کرنے سے پہلے ہمیں اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا چاہیے۔"

محب وطن میجر تمکین تاج کی اس صاف گوئی نے محفل پر ایک سناٹا طاری کردیا۔ نادر محی الدین کو اس ردعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ جبکہ جھرنا بھابی نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نادر محی الدین سے کہا۔

"یہ ایک نجی محفل ہے۔ جس میں ہم نے اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہا ہے۔ ہمیں اس محفل کو سیاسی رنگ نہیں دینا چاہیے۔"

"یہی تو کمزوری ہے بنگالی قوم میں۔" نادر محی الدین نے کہا۔

"آپ لوگ انہیں خوش آمدید کہتے رہیں اور یہ آپ کو جوتے مارتے رہیں گے۔ اب یہی دیکھ لو کہ بریگیڈیئر سراج کے ساتھ کیا ہوا؟"

"سوری سر!" مصطفیٰ کمال ایک دم بول اٹھے۔

"ہم اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گے۔ یہ ایک ذاتی معاملہ ہے اور اس پر کسی بھی قسم کا تبصرہ کرنا مناسب نہیں۔"

"بہت خوب۔" نادر محی الدین طنزیہ مسکرائے۔

"جہاں بات آپ کے مفادات کی ہو۔ وہاں تو سب ہی کچھ جائز ہے۔ لیکن جب سوال ہمارے مفاد کا ہو تو وہاں بات کرنا بھی مناسب نہیں۔ یہ بھلا کیسا انصاف ہے؟"

"صرف آپ کی اپنی سوچ ہے۔" کرنل سلطان کیانی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ نے اپنے آپ کو اس "ہمارے تمہارے" کے خانے میں تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ تو پھر بھلا یہ کیسا انصاف ہوگا؟"

نادر محی الدین اس سوال پر خاموش ہوگئے۔ شاید وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی زبان میں میجر تمکین تاج سے صرف اتنا کہا۔

"ان سب کی تو بات ہی الگ ہے۔ لیکن مجھے تم سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔"

"سوری سر!" میجر تمکین تاج نے بے باک لہجے میں کہا۔

"یہ لوگ میرے ساتھی ہیں۔ میرے بھائی ہیں۔ میں نے ان سب کے ساتھ اپنے وطن کی حفاظت کرنے اور وفاداری نبھانے کا حلف اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر اٹھایا ہے جو مسلمان قوم کا اثاثہ ہے اور رہتی دنیا تک یہ اثاثہ قرآن مجید کی صورت ہمارے درمیان رہے گا۔ میں اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ کبھی عہد شکنی نہیں کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنے ان نظریات کا پرچار کرنا بند کردیں۔ جن نظریات کے تحت خدانخواستہ یہ خطہ آگ کا سمندر بن سکتا ہے۔ یہ خطرناک طرز عمل ہے۔ خدا کے لیے ایسا نہ سوچیں۔"

اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی نوید باری نے ڈرائنگ روم میں آکر نادر محی الدین کو اطلاع دی کہ ان کے لیے بریگیڈیئر سراج کی کال ہے۔ سب نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ نادر محی الدین نے تیزی سے اٹھ کر باہر جانے میں ہی عافیت جانی اور اہل محفل نے سکون کا سانس لیا۔ تقریباً بیزاری کے عالم میں تشریف فرما مسز نزہت باری معذرت کرتے ہوئے چلی گئیں کہ انہیں اپنی کسی دوست کی عیادت کے لیے اسپتال جانا تھا۔

کرنل سلطان کیانی کی کومیلا واپسی تھی۔ انہوں نے بھی اجازت چاہی آج تک وہ بہت خوش تھے کہ ثناء کی طرف سے مطمئن تھے۔ لیکن اب آزردہ تھے کہ وقت خیرخواہوں کا اصلی چہرہ ان کے سامنے لے آیا تھا۔ ثناء انہیں الوداع کہنے باہر تک چلی آئی۔

"بیٹی! تم خوش تو ہو نا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی بہت خوش ہوں۔" وہ مطمئن انداز میں بولی۔ "آپ فکر نہ کریں۔ آنٹی جی دل کی بری نہیں ہیں۔ بس کبھی کبھار بغیر سوچے سمجھے بول جاتی ہیں۔"

"اور نوید۔؟" باپ کے دل نے سوال کیا۔

"وہ بہت اچھے ہیں۔" ثناء نے جواب دیا۔ "میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"جیتی رہو بیٹی!" کرنل سلطان کیانی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ "اللہ پاک تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

اور بہت سے آنسو بیگم نور سلطان نے اپنی پلکوں کے پیچھے روک لیے۔ ثناء انہیں حال دل سنا چکی تھی۔ وہ بتا چکی تھی کہ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد انہیں بیاہ کر لانے والی مسز نزہت باری نے اب اپنا رویہ یکسر بدل لیا تھا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے ہر بات پر بے لاگ تبصرہ کرتیں اور نادر محی الدین ان کے ہر لفظ کی بھرپور تائید کرتے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ قطعی طور پر یہ فراموش کر دیتیں کہ اس گھر میں بیاہ کر لانے والی ثناء سلطان کا دل ان کی ایسی گفتگو پر کتنا آزردہ ہوتا ہے؟ کس قدر روتا ہے؟ انہیں اس سے قطعی کوئی سروکار نہ تھا۔

اور وہ۔؟ نوید باری۔ اس کا خدائے مجازی۔ وہ تو مٹی کا مادھو تھا کہ خدا کے بعد اپنی ماں کو درجہ دیتا تھا۔ ایسا کرنا بے شک حق ہی سہی۔ لیکن وہ بیوی کے فرائض سے غافل تھا۔ اور وہ اپنے ماں باپ کی آن پر قربان ہو کر مشرقیت کی اس اہم روایت کو نبھا رہی تھی کہ "جس گھر میں ڈولی جائے۔ وہاں سے جنازہ نکلے۔"

"یہ لوگ وہ نہیں ہیں۔ جو نظر آتے ہیں۔" اس نے اپنی ماں کو بتایا تھا۔ "ابو جی کو کچھ نہ بتائیے گا۔ وہ دکھی ہو جائیں گے۔ نادر ماموں اب مستقل طور پر یہیں قیام پذیر ہو گئے ہیں۔ "باری ہاؤس" اب سازشوں کا گڑھ بن گیا ہے۔ عجیب قسم کے لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ اور منفی قسم کے نظریات کا پرچار کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابل برداشت ہی سہی لیکن پھر بھی میں خوش ہوں اور پر امید بھی۔ نوید پی ایچ ڈی کرنے جرمنی جا رہے ہیں۔ شاید میں بھی ساتھ جاسکوں۔"

(تیسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

ساجدہ حبیب

درد کی دوا ہو وفائیں

70ء کی دہائی کے مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی اس کہانی کے کردار وطن کی محبت اور رشتوں کی ڈور میں بندھے نظر آتے ہیں۔ میجر حسن امام تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ان کے والد مرتضیٰ امام نے سرکاری افسری میں بھی نیک نامی ہی کمائی۔ مشرقی پاکستان پوسٹنگ کے دوران ان کی نظر منو میر علی پر ٹھہرتی ہے اور وہ پہلی نظر میں ہی اس کی باوقار اور سلجھی شخصیت کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔

منو میر علی' رفیق صدیقی کی سربراہی میں وفد کے ساتھ دورے پر مشرقی پاکستان آئی ہے اور کرنل سلطان کیانی کی بھانجی ہے۔

پوٹھوہار سے تعلق رکھنے والے کیپٹن شاہویال کو مشرقی پاکستان آتے ہوئے علم نہ تھا کہ یہاں پروفیسر قمرالدین قاضی کی صاحبزادی ڈاکٹر سنبل عرف ثریاء کی کالی آنکھیں اپنا اسیر کرلیں گی۔ کیپٹن شاہویال اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ شاہویال کی تربیت بے جی نے مضبوط پیمانے پر کی ہے۔ بچپن میں ماں باپ سے محرومی نے اسے بے حد حساس اور ذمہ دار بنا دیا ہے۔ تایا محمد خان نے اس کے سر پر سایا شفقت رکھا۔ وہ اپنی آباء کی پیروی کرتے ہوئے فوج میں کمیشن لیتا ہے۔

بڑی بہن کو کم عمری میں طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ اور ننھی گگی ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ شاہویال بنگالی ڈاکٹرنی سے گھر بھر میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ لیکن تایا محمد خان اور شاہویال سب کو مطمئن کردیتے ہیں۔ ڈاکٹر ثریاء کے انتخاب پر زینب اور بے جی بے حد مسرور ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ثریاء کی چھوٹی بہن کومل' کیپٹن شاہویال اور ڈاکٹر ثریاء کے درمیان پل کا کام کرتی ہے جبکہ اکلوتے بھائی ممتاز قاضی عرف مستی کو گھر میں اس کی آمد و رفت قطعاً پسند نہیں ہے۔ شاہویال اپنی طرف سے بات کرنے کے لیے اپنے سینئر افسر میجر سکین تاج اور بھرنا بھابھی سے درخواست کرتا ہے' وہ اسے اپنے مکمل تعاون کا یقین

مکمل ناول



دلاتے ہیں۔

نادر محی الدین بد طینت گھاگ سیاست دان ہے جو وطن دشمن عناصر کے ساتھ مل کر ملک توڑنے کے منصوبے پر کام کررہا ہے' اس سلسلے میں وہ بریگیڈیئر سراج کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ نادر محی الدین کی بہن نزہت باری ان ہی کی طرح متعصب ذہنیت رکھتی ہیں۔ انہیں اپنے لاڈلے اور ضدی بیٹے نوید باری کے لیے کرنل سلطان کی بیٹی شانو پسند آجاتی ہے۔ کرنل کیانی کو بیگم نزہت کی ہٹ دھرمی ناگوار گزرتی ہے۔ تاہم نادر محی الدین اور بریگیڈیئر سراج کے داؤ میں کرنل سلطان کا گھرانہ اپنی سادہ لوحی کے باعث آجاتا ہے۔

بریگیڈیئر سراج کے شر انگیز بیان پر مغربی پاکستان سے آیا وفد بائیکاٹ کرتے ہوئے دورہ مختصر کرتا ہے۔ سینیٹر رکن رفیق صدیقی کی شکایت پر بریگیڈیئر سراج کی جی ایچ کیو میں طلبی ہو جاتی ہے۔ کھسیاہٹ میں وہ مغربی پاکستان سے آئے میجر حسن امام اور میجر مصطفیٰ کمال پر غصہ نکالتے ہیں۔ میجر حسن امام اور میجر مصطفیٰ کی بھی جی ایچ کیو حاضری ہوتی ہے۔

کرنل سلطان کیانی کی بیٹی کی شادی میں میجر حسن امام کی منزہ میر علی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے' اس کے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ سوئے اتفاق وہ بھی اس فلائٹ سے واپس مغربی پاکستان جا رہی ہے' جس سے میجر حسن اور میجر مصطفیٰ کی واپسی ہے۔ میجر مصطفیٰ کمال محبت کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے میجر حسن امام کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۳

تیسری اور آخری قسط

وہ نہایت پریقین لہجے میں اپنی ماں سے مخاطب تھی اور نہایت سادہ فطرت اور کم گو بیگم نور سلطان حیرت کے عالم میں اپنی لاڈلی شانو سلطان کی بیان کردہ اس حقیقت کو سن کر حسب روایت مشرقی سوچ و فکر کے مطابق اس امر کو بھی نصیبوں کے لیے لکھے گئے کھاتے میں ڈال رہی تھیں کہ عام طور پر ہمارے ہاں تو ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ لیکن سفر کے دوران اپنی بیگم کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے کرنل سلطان کیانی کو بہت کچھ بتا دیا۔ انہوں نے کوئی سوال نہ کیا۔ کچھ نہ پوچھا۔ جانتے تھے کہ اس ضمن میں خاموشی میں ہی عافیت ہے۔

شہر پر شام چھائی۔ تو میجر سکین تاج کے گھر کے اندر سجی ہوئی سہاگ کی سیج دیکھ کر منزہ حسن امام کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بڑا عجیب تضاد تھا۔ ایک وطن' ایک خط' ایک قائد اور ایک پرچم تو پھر رویوں میں اس قدر تضاد کیوں؟ یہ سوچوں کا تسلسل تھا اور پر حقیقت یہ تھی کہ ثمرہ بھابھی بڑی بہنوں کی طرح صدقے واری جارہی تھیں۔ ڈاکٹر ثریا تو صبح سے شام تک ان کے ساتھ تھیں۔ سارا دن کچھ خوشگواری اور کچھ بیزاری کی سی کیفیت میں گزرا تھا۔ لیکن اب میجر سکین تاج کے گھر کے تجمل پر گویا ساری وحشت دور ہو چکی تھی۔ مصطفیٰ کمال حسن امام سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے۔

"امام! ہماری اور تمہاری دوستی [illegible] اب میں سوچ رہا ہوں [illegible] کروا دیں۔ تو بھلا ہوگا۔"

"کون کا کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"بھئی یہی اپنا کاکا شاہ پال کیانی۔" وہ جھٹ سے بولے۔

"اگر حساب کتاب دوستی سے جانچا جائے تو دنیائے عشق کے نامی گرامی ہیروز کے بعد صرف اسی کا نمبر بنتا ہے۔"

"مگر تم تو اس بات کے خلاف تھے۔ اور اعتراض کرتے تھے۔ کہ قمرالدین قاضی صاحب کے ہاں اس کا آنا جانا کیوں ہے؟"

"لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔" اس نے اعتراف کیا۔ "اب وہ وقت گزر چکا۔ جب میرا خیال تھا کہ یہ کوئی زیادہ اچھی قسم کے لوگ نہیں ہیں۔ جب سے انہوں نے مجھے بطور خاص کھانے کی دعوت دی ہے۔ میں نے اپنی رائے بدل لی ہے۔"

مصطفیٰ کمال نے کہا۔ میجر سکین تاج نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو گویا تم انسانوں کو دعوت کی کسوٹی پر پرکھتے ہو۔"

"یقیناً"۔ اس نے جواب دیا۔ "ہمارے ہاں پنجابی میں کہا جاتا ہے کہ "بیٹھ نہ پیاں روٹیاں۔ تے بھی گلاں کھوتیاں" میجر سکین تاج کے کہنے پر شاہ پال نے اس محاورے کا بنگالی ترجمہ کیا۔ تو مصطفیٰ کمال نے کہا۔

"برادر عزیز۔ اب ایک اور محاورے کا ترجمہ بھی پیش کردو۔"

"وہ کیا سر؟" شاہ پال نے پوچھا۔

یہی کہ "جس کے ہاتھ میں ڈوئی اس کا ہر کوئی۔"

"بہت خوب سر!" شاہ پال نے داد دی۔ "لیکن ایک بات اور بھی ہے؟"

"کون سی بات۔" مصطفیٰ کمال نے پوچھا۔

"مجھے ابھی تک اس بات کا عملی طور پر تو تجربہ نہیں ہے۔ مگر میں نے سنا ہے کہ گھریلو زندگی میں خانہ جنگی کے دوران یہ کار آمد اشیائے ضرورت از قسم ڈوئی اور بیلنا وغیرہ بطور ہتھیار استعمال میں لائے جاتے ہیں۔"

"تم نے بالکل صحیح سنا ہے۔" مصطفیٰ کمال نے تائید کی۔ "ویسے ازدواجی زندگی سے قبل ہی۔ اس وقت قدرت نے تمہارے لیے یہ تجربہ کرنے کا۔ نہایت اہم موقع فراہم کر رہا ہے۔" ڈاکٹر ثریا اس وقت ثمرہ بھابھی [illegible] کرو۔"

"نہیں سر! وہ تو بہت اچھی ہے۔" شاہ پال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"برخوردار! تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔" مصطفیٰ کمال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تمہاری عقل ناقص اور تجربہ صفر ہے۔ تم نہیں جانتے کہ یہ مخلوق صرف اسی وقت تک اچھی ہوتی ہے۔ جب تک اپنے والدین کے ہمراہ اپنے میکے میں مقیم ہوتی ہے۔ سہاگ کا تاج پہن کر یہ کیسی بلندیوں پر پرواز کرتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم۔"

"لیکن سر آپ کو کیسے معلوم ہے؟" شاہ پال نے سوال کیا۔

"بھئی میں تو ہمیشہ سے ایک مشترکہ خاندانی نظام میں مقیم رہا ہوں اور ازدواجی زندگی کے کسی نہ کسی نازک موڑ پر اس قسم کی بین الاقوامی جنگوں کا عینی شاہد ہوں۔"

"اچھا ایک بات تو بتاؤ۔" میجر سکین تاج نے پوچھا۔ "میجر امام اور بھابھی منزہ کی جوڑی تو فٹ ہو گئی۔ یہ تم اپنی جوڑی کے فٹ ہو جانے کی خوش خبری کس حساب کتاب کے تحت سنا رہے تھے۔"

"یہ تم مت پوچھو میرے دوست۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ ایک دردناک داستان ہے۔ اور اس داستان کا مرکزی کردار پھاگن کا وہ مہینہ ہے۔ جو ہر سال آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔"

"سر! اس ساری داستان میں بے چاری پھاگن کا کیا قصور ہے؟" شاہ پال نے پوچھا۔

"چلو تمہارا اصرار ہے۔ تو میں بتا دیتا ہوں۔" مصطفیٰ کمال نے بات شروع کی۔ "سکین تاج کو تو شاید علم ہے یا نہیں۔ لیکن تم اور حسن امام تو بخوبی جانتے ہو گے کہ ہمارے ہاں پنجاب میں جب پھاگن کا مہینہ آتا ہے۔ تو کھیتوں میں ہر سو پھیلی ہوئی سرسوں بڑا خوب صورت سماں بکھیر رہی ہے۔ اب بظاہر تو یہ نظارہ بہت حسین ہوتا ہے۔ لیکن اندر خانے اس پر کیا گزرتی ہے۔ یہ تو بے چاری سرسوں ہی جانتی ہے۔ جو انسانوں کی خوراک اور جانوروں کا چارہ بنتی ہے۔ اسی طرح ازدواجی بندھن میں بندھنے والے ہی جانتے ہیں کہ وہ اب کس پل صراط کو عبور کرنے والے ہیں۔ بہرحال میں اس بات سے ذرا ہٹ کر ایک لطیفہ سنانا چاہوں گا۔"

"ضرور سنائیں۔" میجر سکین تاج نے کہا۔ تو مصطفیٰ کمال نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتایا۔

"ہمارے کالج کے ایک پروفیسر صاحب کو اپنی تصاویر بنوانے اور پھر انہیں مناسب ترتیب سے سجانے کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنا تصویری البم اپنے عزیز و اقارب کو دکھا رہے تھے۔ کہ ایک فل سائز تصویر سامنے آگئی۔ جس میں پھولوں کے ہار پہنے ہوئے حاضرین محفل کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اور ان کے چہرے پر چھایا ہوا خوف و ہراس تصویر میں بھی نمایاں تھا۔ تصویر دیکھنے والے صاحب نے پوچھا۔

"یہ تصویر تب کی ہے نا جب آپ سینئر لیکچرار تھے اور آپ نے گورنمنٹ سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے تو

دن کی بھوک ہڑتال میں حصہ لیا تھا۔"
"نہیں یار۔" پروفیسر صاحب نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو... میرے نکاح کے فوراً بعد کی تصویر ہے۔" میجر سکینہ تاج کے ڈرائنگ روم میں اونچے اونچے قہقہے گونجے۔ تو جمرہ بھابھی کچن سے چلی آئیں۔
"کیا ہوگیا ہے آپ لوگوں کو؟ منزہ بھابھی آرام کر رہی ہیں۔ بھلا کیا سوچیں گی وہ؟"
"اب بھلا وہ کیا سوچیں گی۔" مصطفیٰ کمال نے حسن امام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ رات کھانے پر یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور کی گئی ہے کہ مغربی پاکستان میں مقیم شاہ پال کی بے بی کا مکمل طور پر عندیہ آنے کے بعد (جو کہ اب آنے ہی والا تھا) برخوردار کی منگنی کی رسم ادا کردی جائے۔ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔"
چنانچہ جب یہ دن تمام ہوا اور مہمانوں نے رخصت لینا چاہی تو مصطفیٰ کمال نے لڑکھڑاتے ہوئے حسن امام سے التجا کی۔
"یار تم میرے ساتھ چلو۔ مجھے میس کے اس کمرے میں تمہارے بغیر بہت ڈر لگتا ہے۔ چڑیلیں بلاوجہ مجھے خواب میں آکر ڈراتی ہیں۔"
"تم میجر فیروز خان سے کمرہ شیئر کرلو۔" حسن امام نے کہا۔ "سنا ہے کہ اس کی پوسٹنگ بھی یہاں ہی ہو گئی ہے۔"
"تم نے صحیح سنا ہے۔ لیکن تمہاری جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔" مصطفیٰ کمال نے کہا۔
"میری بڑی مجبوری ہے یار ورنہ میں تمہارا ساتھ نہ چھوڑتا۔" حسن امام نے اسے تسلی دی۔
"تم ایسا کرو۔" مصطفیٰ کمال نے کہا۔ "اپنی مجبوری کو یہاں ہی چھوڑو اور خود میرے ساتھ چلو۔"
ایسی ہی نوک جھونک کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ رہے تھے کہ اچانک تیز رفتاری سے چلتی ہوئی ایک گاڑی گیٹ پر آن رکی اور غصے سے بھرا ہوا امتیاز قمرالدین عرف مستی اندر چلا آیا۔
"آپی۔" اس نے سنبل عرف بیاہ کو مخاطب کیا۔
"آپ صبح سے ان لوگوں کے درمیان کیا کر رہی ہیں؟"
"میں بابا کی اجازت سے آئی تھی۔" ڈاکٹر بیاہ نے شرمندگی کے احساس سے دوچار اپنی صفائی پیش کی۔
"بابا نے ہی تو آپ کا دماغ خراب کیا ہے۔" وہ بولا۔
"میں بتا رہا ہوں کہ بہت پچھتائیں گی۔"
اس کا حد سے بڑھتا ہوا گستاخ رویہ دیکھتے ہوئے میجر سکینہ تاج اسے بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے گئے۔ اس نے چند منٹ تک خوب بحث کی اور پھر غصے میں گاڑی لے کر چلا گیا۔
"جوان خون ہے۔" میجر سکینہ تاج کہہ رہے تھے۔
"اس عمر میں ایسی گستاخی سرزد ہو ہی جاتی ہے۔ پلیز آپ لوگ کچھ خیال نہ کریں۔" پھر وہ بیاہ سے مخاطب ہوئے۔
"میں اور جمرہ آپ کو چھوڑ آئیں گے۔"
بدمزگی تو ہو ہی چکی تھی۔ لیکن مصطفیٰ کمال کی روایتی شوخ فطرت طبیعت نے بات سنبھال لی۔
"ہاں تو بات ہو رہی تھی۔ وہ اپنے چچا کرن کی۔" اس نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ "تو جناب والا۔ اس مرتبہ ہمارے تایا جی نے پکا وعدہ کیا ہے۔ کہ ان شاء اللہ وہ اگلے چچا کرن میں ضرور ہماری ڈولی اٹھادیں گے۔"
"تمہاری ڈولی اٹھادیں گے۔ یا پھر اپنی بیٹی کی؟" حسن امام نے پوچھا۔
"وہی ایک ہی بات ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "مقصد تو ایک ہی ہے نا۔ بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔"
"پھر ہم اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل پر تمہیں شاندار تحائف پیش کرتے ہوئے زبردست دعوت کا اہتمام کریں گے۔" میجر سکینہ تاج نے کہا۔
"او مائی گاڈ!" مصطفیٰ کمال چلایا۔ "تحائف سے یاد آیا۔ میری بہنوں نے آپ سب کے لیے تحائف دیے تھے۔ مجھے پہنچانے یاد ہی نہیں رہے۔ میں کل ضرور لے آؤں گا۔"
"کل آپ سب ڈنر پر دوبارہ تشریف لائیں گے۔" جمرہ نے کہا۔
"آج کی دعوت سکینہ کی طرف سے تھی۔ لیکن کل کی دعوت میری طرف سے ہوگی۔"
اس تجویز اور دعوت کا خیر مقدم کیا گیا۔ رات گہری ہو چلی تھی۔ لہٰذا رخصت چاہی گئی اور مغربی پاکستان سے آنے والے مہمان اس قدر پذیرائی پر شکریہ ادا کرتے ہوئے اظہار ممنونیت کے طور پر اک رقت انگیز کیفیت میں پائے گئے۔



محبتوں اور آورشوں کا دور آہستہ آہستہ شورش کا لبادہ اوڑھنے لگا تھا۔ غالباً شب برات کی رات تھی۔ جب بریگیڈیئر سراج نے دیوالی سے تشبیہ دی۔ پروفیسر روشن خیال نے تائید کی۔ اور نادر علی الدین نے اسے سیاسی بیان کے رنگ میں رنگ کر یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ یہاں سے دور بہت دور ہیں۔ ہمیں ان کی طرف دیکھنے کے بجائے ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ جو ہمارے قریب ہیں۔ اخبارات نے ان تمام حالات اور بیانات کو خوب اچھی طرح ہائی لائٹ کیا۔ فوج کی فضا تو پہلے ہی بریگیڈیئر سراج کے استعفیٰ کی وجہ سے ٹینس تھی۔ رہی سہی کسر ان کے اس بیان نے پوری کردی۔ کہ جس کے تحت وہ عنقریب ایک سیاست دان کے طور پر "بیچے بنگال" جوائن کرنے والے تھے۔ بریگیڈیئر خلیل الرحمان شعلہ نے ان تمام حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنے آفیسرز سے مشاورت کی۔ وہ بذات خود بریگیڈیئر سراج سے بات کرنا چاہتے تھے۔ ان کا رد عمل دوسرے کئی آفیسرز کے لیے حوصلہ افزا ہو سکتا تھا اور یہ ایک خطرناک رجحان بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جھجکتے ہی اس دیوار کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا گیا۔
ایک لاتعلق اور بے پروا اجنبی کی سی اجنبیت کے ساتھ بریگیڈیئر سراج کمرے میں داخل ہوئے۔ در و دیوار نے پرانی شناسائی کے احساس کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا۔ اظہار یک جہتی کے طور پر بریگیڈیئر خلیل نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے ملنے کے لیے بڑھنا چاہا۔ لیکن بات فقط رسمی مصافحے تک محدود رہی۔ وہ تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اپنے چہرے پر ایک کرختگی لیے ہوئے نشست پر تشریف فرما ہوگئے۔ بریگیڈیئر خلیل نے رسمی طور پر حال احوال دریافت کرتے ہوئے بات شروع کی۔
"آپ کیسے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔
"کیوں؟" وہ تیکھے لہجے میں بولے۔ "کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ہم کیسے ہیں؟"
"اگر کسی بھی قسم کا احساس کمتری آپ کی زندگی کی راہ میں حائل نہیں۔ تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ماشاء اللہ آپ بالکل خیریت سے ہیں۔" بریگیڈیئر خلیل نے کہا۔
"جی نہیں۔" وہ تڑپ کر بولے۔ "آپ بھول رہے

ہیں۔ اگر بالکل خیریت ہوتی تو کم از کم مجھے قبل از وقت فوج کو الوداع نہ کہنا پڑتا۔"
"یہ تو آپ کا انفرادی اور ذاتی فیصلہ ہے۔" بریگیڈیئر خلیل نے کہا۔
"اور آپ بھول رہے ہیں کہ قومیں افراد ہی سے تشکیل پاتی ہیں۔" بریگیڈیئر سراج نے کہا۔
"درست فرمایا آپ نے۔" بریگیڈیئر خلیل نے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "ہم یقیناً" ایک متحد قوم ہیں۔ محض افراد کا ہجوم نہیں۔ ہمیں ایک ہو کر سوچنا چاہیے کہ ہماری سلامتی اسی میں ہے۔"
بریگیڈیئر سراج نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر تیزی سے بولے۔
"بہتر ہو گا کہ آپ یہ بات مجھے سمجھانے کے بجائے اپنے مغربی پاکستان کے ان سیاست دانوں کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ جو اب اپنے مقاصد کے حصول کے لیے فوج کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" "ورنہ اب یہ معاملہ سیاست کی حد سے اٹھ کر میدان جنگ تک آنے ہی والا ہے۔"
"جنگ۔" بریگیڈیئر خلیل نے سوال کیا۔ "آپ یہ جنگ کس سے اور کس لیے لڑیں گے؟"
"اپنے وطن کے لیے۔" انہوں نے غصے سے جواب دیا۔
"کیا آپ کا وطن کہیں کوئی الگ حیثیت رکھتا ہے؟" بریگیڈیئر خلیل نے سوال کیا۔
"کیا پاکستان آپ کا وطن نہیں؟" بریگیڈیئر سراج کوئی جواب نہ دے سکے۔ اب وہ بلاوجہ خلا میں گھور کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ بے حد پریشان ہیں۔
"بریگیڈیئر سراج؟" بریگیڈیئر خلیل نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"
"جس ملک میں آپ پر ظلم اور زیادتی کی جا رہی ہو۔ جہاں آپ کو انصاف نہ ملے۔ اسے آپ اپنا وطن نہیں کہہ سکتے۔" بریگیڈیئر سراج نے جواب دیا۔
"بہت خوب۔" بریگیڈیئر خلیل الرحمان نے اونچی آواز میں کہا۔ "کیا آپ اس بات کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے کہ بحیثیت کیڈٹ سے فوج کے اس اعلا ترین رینک تک پہنچنے کے دوران آپ سے کس قسم کی زیادتی روا رکھی گئی؟ کون سا ظلم آپ کی ذات پر ڈھایا گیا اور کون سی ناانصافی کی گئی؟"
"میں اپنی نہیں۔ اپنی قوم کی بات کر رہا ہوں۔" بریگیڈیئر سراج نے کہا۔
"ہم سب تو پاکستانی ہیں۔ پھر بھلا آپ کس قوم کی بات کر رہے ہیں؟" بریگیڈیئر خلیل نے پوچھا۔
"میں بنگالی قوم کی بات کر رہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔
"بنگالی قوم؟" بریگیڈیئر خلیل نے حیرت سے سوال کیا۔ "تو کیا بنگالی پاکستانی نہیں؟"
"پاکستانی تو ضرور ہیں۔ لیکن اپنی الگ حیثیت قائم کرنے، اپنی علیحدہ شناخت رکھنے اور ظلم و زیادتی کے علاوہ ناانصافی کے خلاف بطور احتجاج انقلاب لانے کا عزم رکھنے کے سبب الگ بھی ہو سکتے ہیں۔" بریگیڈیئر سراج نے صاف اور واضح لفظوں میں کہا اور سننے والے سب ہی ششدر و حیران رہ گئے۔ تو کیا واقعی علیحدگی کی سوچ نے اب عمل میں ڈھلنے کا عزم کر لیا تھا؟
"بریگیڈیئر سراج!" بریگیڈیئر خلیل نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اس خطہ زمین کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی ہے۔ ہم کل بھی اکٹھے تھے۔ آج بھی ایک ہیں اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہیں گے۔"
"یہ آپ سب کی خوش فہمی ہے۔" بریگیڈیئر سراج نے کہا۔ "تم اپنے کل کو اپنے خوابوں میں دیکھتے رہو۔ لیکن ہمیں تو اپنے آج کی تعبیر چاہیے۔"
"اچھا تو اب بات یہاں تک آن پہنچی ہے۔" بریگیڈیئر خلیل نے کہا۔ "مت بھولو کہ ہم 1965ء کی جنگ میں اس وطن کی سالمیت کے لیے اکٹھے لڑے تھے۔"
"وقت کی اس سب سے بڑی غلطی پر ہم آج بھی پچھتا رہے ہیں۔" بریگیڈیئر سراج نے جواب دیا۔
"تو پھر آؤ میرے ساتھ واہگہ بارڈر پر چلو اور شہدا کی یادگار پر کھڑے ہو کر اعتراف کرو کہ تمہارا یہ عمل غلط تھا۔" بریگیڈیئر خلیل کہہ رہے تھے۔ "اگر یہ وطن اس وقت تمہارا تھا۔ تو اب کیوں نہیں؟"
"وقت اور حالات بدل چکے ہیں۔" بریگیڈیئر سراج نے کہا۔ "ہم نے ظلم و زیادتی کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب آپ لوگوں کی طرف سے روا رکھی جانے والی

کسی بھی ناانصافی کو ہم لوگ پھولوں کے ہار سمجھ کر اپنے گلے میں ڈالنے کی غلطی بھی نہیں کریں گے۔"
یک دم سناٹا چھا گیا۔ فضا خاموش ہو گئی اور ہوائیں دم بخود کہ بریگیڈیئر سراج کی طرف سے کیا گیا یہ اعتراف آنے والے خطرناک حالات کی صاف تصویر دکھا رہا تھا کہ بات اب قومیت کی سوچ تک آن پہنچی تھی۔
گویا کہ یہ انقلاب کا نقطہ آغاز تھا۔
بریگیڈیئر سراج کو قائل کرنے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ آخری حربے کے طور پر بریگیڈیئر خلیل نے دلائل کے پہاڑ کھڑے کرتے ہوئے کہا۔
"کیا آپ لوگوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ اپنوں کو دھتکار کر غیروں کو اپنا خیر خواہ جانتے ہوئے تم لوگ کیا بن جاؤ گے۔ پانی اور دشمن کے درمیان گھرا ہوا ایک جزیرہ۔ تمہاری پہچان، تمہارا نام کچھ بھی نہیں رہے گا۔"
"آپ لوگ یقیناً" کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔" بریگیڈیئر سراج نے طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم اپنی الگ شناخت اور اپنے الگ نام کی خاطر ہی تو ایک ایسی تحریک چلا رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہمیں نہ صرف یہ کہ ایک الگ نام اور پہچان ملے گی۔ بلکہ انصاف بھی ملے گا۔"
"اگر ایسا ہی تھا تو پھر بھلا برصغیر کی تقسیم کا عمل کس تحریک کے زمرے میں آئے گا۔" بریگیڈیئر خلیل نے سوال کیا۔
"ہم اس غیر فطری تقسیم کو نہیں مانتے۔" بریگیڈیئر سراج نے دو ٹوک جواب دیا۔ "یقیناً" یہ تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی ہے۔"
ماحول بے حد کشیدہ تھا۔ کہ اچانک میجر فیروز خان کے غصے نے جوش مارا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بریگیڈیئر سراج کے قریب چلا گیا اور فوج کے روایتی پروٹوکول کو یکسر فراموش کرتے ہوئے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
"سراج بھائی! آپ غلط سوچ رہے ہیں۔"
بریگیڈیئر سراج نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر اس کا ہاتھ جھٹکا اور درشت لہجے میں کہا۔
"معاف کرنا فیروز خان! میں تمہارا بھائی نہیں ہوں۔"
"بالکل ٹھیک۔" میجر فیروز خان نے حیرت سے پوچھا۔ "تو کیا پھر آپ ہمارے دشمن ہیں؟"
"بے شک۔" دوسری سمت سے جواب آیا۔ "مگر اب دوستی کا زمانہ گزر گیا۔"
ڈھاکہ شہر کے آسمان پر چھائے ہوئے بادل گرج گرج کر برسنے لگے اور برستی بارش کی بوچھاڑ برآمدے تک چلی آئی۔ اعصاب شکن تناؤ کی کیفیت میں بریگیڈیئر سراج کمرے سے باہر نکلے۔ سامنے ستون کے قریب میجر سکین تاج کھڑے تھے۔ ہمت، وفاداری، خلوص اور عظمت کی مثال، کہ اپنے تن پر خاکی وردی کا پیراہن سجائے ہوئے وہ آج بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ تھے اور اپنے ان ہم قوموں سے نالاں۔ جنہیں اغیار نے اپنے جال میں جکڑ لیا تھا۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر آج بھی وردی تو ایک جیسی تھی۔ لیکن وفائیں بدل چکی تھیں۔ وعدے ٹوٹ رہے تھے۔ بریگیڈیئر سراج نے انہیں دیکھا اور ایک طنزیہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔
"یہ تم نے اپنے گھر میں غیروں کے لیے بیج بچانے کا ٹھیکہ کب سے لے لیا؟"
کمرے سے باہر آتے ہوئے حسن امام اور مصطفیٰ کمال نے یہ بات سنی اور ردعمل جانچنے کے لیے میجر سکین تاج کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن وہاں گہری...... بہت گہری خاموشی تھی!
بریگیڈیئر سراج نے فقط چند سیکنڈ کے لیے رک کر اس کی طرف سے آنے والے جواب کا انتظار کیا اور پھر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔
میجر فیروز خان ان سب کے قریب آ گئے۔ ان کی آمد سے پہلے دوستوں کا یہ گروپ مثلث کہلاتا تھا۔ لیکن ان کی شمولیت کی بنا پر اب چوکڑی کہلانے لگا تھا۔
میجر فیروز خان کا تعلق چارسدہ سے تھا۔ وہ حسبی نسبی پٹھان تھے اور اپنے علاقے و قبیلے کی پانچ ہزار سالہ تاریخ پر بڑا فخر و مان رکھتے تھے۔ نہایت بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ شعر سنانے کا بے حد شوق تھا۔ اور اکثر گفتگو کے دوران مزاحیہ اشعار سنا کر محفل کو کشت زعفران بنا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی اپنے دوستوں کے تنے ہوئے چہروں کو معمول اور مزاج کے مطابق لانے کے لیے انہوں نے گیٹ کی طرف رواں بریگیڈیئر سراج کی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"لو
دل ہم نے دیا تھا دلدار سمجھ کر
وہ بے وفا کھا گیا نسوار سمجھ کر"

سب ہی چہروں پر نفسی کی جوت جگی تو فوراً "ہی ڈسپلن" کا لحہ سامنے آگیا۔ بریگیڈیر خلیل الرحمان شعلہ باہر آئے تھے اور اپنے آفیسرز کے سامنے اعتراف کیے میں بولے۔
"سوری جنٹل مین! میں بریگیڈیر سراج کو قائل نہیں کرسکا۔"
مصطفےٰ کمال نے بغور ان کی طرف دیکھا۔ وہ کالج میں اس سے سینئر تھے۔ بہترین طالب علم اور اپنے کالج کے بہترین مقرر۔ "آل پاکستان ڈیبیٹنگ سوسائٹی" کے زیر اہتمام منعقد کردہ مقابلوں میں "اپنے کالج کے لیے ٹرافی لانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ فی البدیہہ بولتے اور سامعین کے سامنے دلائل کا ڈھیر لگا دیتے۔ مقابلے کے لیے مقرر کردہ منصفین ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور ٹرافی کا فیصلہ ہو جاتا۔ اسی بنا پر انہیں شعلہ کا لقب عطا کیا گیا تھا۔ لیکن کیا آج وہ ہار گئے تھے؟ اپنی تمام تر ذہانت اور دلائل سمیت۔ ان کے پاس قائل کرنے کے لیے کوئی دلیل باقی نہ بچی تھی؟ وہ تو مخالفین پر چھانے کی صفت رکھتے تھے۔ لیکن آج ان مخالفین انہیں ہرانے کے درپے تھے اور یہ بہت گمبیھر لمحہ فکریہ تھا۔
بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی اور پھر اچانک میجر فیروز کی آواز آئی۔
"فکر کی کوئی بات نہیں سر۔ انسان ہی انسان کا دارو ہے۔ یہ لوگ بھی سمجھ جائیں گے۔ فی الحال دشمنوں نے ان کے اندر شرپسندی کے شرارے بھر دیے ہیں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"اس سے پہلے کہ یہ شرارے آگ کا بھڑکتا ہوا الاؤ بن جائیں۔ ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔" بریگیڈیر خلیل الرحمان نے فکرمندی سے کہا۔
"ہتھیار اٹھانے سے پہلے مذاکرات کا عمل بہت ضروری ہوتا ہے۔" میجر فیروز خان نے اپنی رائے دی۔
"یہ سیاست دانوں کا کام ہے سر! اس مسئلے کو سیاسی سطح پر حل ہونا چاہیے۔"
"بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" بریگیڈیر خلیل نے کہا۔
"میں کوئی بہت زیادہ دانش ور یا بھر دور اندیش نہیں ہوں۔ لیکن خدا جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اس معاملے میں ہمارے سیاست دان فوج کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش کریں گے۔"
"اسی بات کی تو پیش بندی کی جا رہی ہے۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔ "اگر ہم ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی فوج کے اصول کے مطابق "سب اچھا" کی رپورٹ دیتے رہے تو شاید وقت ہمارے ہاتھ نہ آسکے۔ ہم بہت کچھ کھو سکتے ہیں۔"
"نہیں' ان شاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" میجر تمکین تاج کے دل سے نکلی ہوئی آواز زبان پر آگئی۔ "ایسی منفی سوچ اور ایسے خیالات صرف چند افراد کے ہیں۔ یہ رائے تو محض کچھ لوگوں کی ہے۔ اور ساری قوم کا اس سے متفق ہونا قطعی ضروری نہیں۔"
اگرچہ سب ہی دل گرفتہ تھے۔ لیکن مایوس نہیں تھے۔ بریگیڈیر خلیل چلے گئے۔ تو حسن امام نے تمکین تاج سے مخاطب ہو کر کہا۔
"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے گھر میں شفٹ ہو جانا چاہیے۔"
"بالکل۔" مصطفےٰ کمال نے تائید کرتے ہوئے کہا۔
"میرا بھی یہی خیال ہے۔"
میجر تمکین تاج یہ بات سن کر آزردہ ہو گئے اور انہوں نے خفگی کے لہجے میں کہا۔
"میرا خیال ہے کہ آپ دونوں نے بریگیڈیر سراج کے فقرے کو بے حد محسوس کیا ہے۔ اگر آپ میری اور جھرنا کی مرضی کے برعکس ایسا قدم اٹھائیں گے۔ تو میں یہ سمجھوں گا کہ اب آپ لوگوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا ارادہ کر لیا ہے؟"
"نہیں نہیں' یہ بات نہیں ہے۔" حسن امام نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کی۔ "آپ سے اجازت لینے کے بارے میں تو ہم پہلے ہی سوچ رہے تھے۔ شاید میں نے یہ بات مناسب موقع پر نہیں کی۔"
"بہرحال میرے بھائی۔ تم اپنی بھابھی سے بات کر لو۔ اگر وہ اجازت دیتی ہیں تو بصد شوق اپنے گھر تشریف لے جاؤ۔ میں تمہاری خوشیوں کے لیے دعاگو ہوں۔" میجر تمکین تاج نے اس کی بات کاٹ دی۔
یہ بڑا عجب تضاد تھا کہ ایک طرف تو بھائی چارے کی فضا تھی۔ اور دوسری طرف دشمنی کی روش' درمیان میں رہنے والے پریشان تھے کہ کس طرف جھکیں۔
چنانچہ مصطفےٰ کمال کی تجویز کے مطابق فیصلہ کیا گیا کہ

مغربی پاکستان سے پروفیسر اکرم قریشی صاحب کو مدعو کیا جائے تاکہ وہ اپنے ہم جماعت اور دوست پروفیسر روشن خیال کو اپنے نقطہ نظر سے یہ باور کرا سکیں کہ استاد کو ہمیشہ اخلاقیات کا سبق دینا چاہیے۔ انقلاب کا نہیں قوموں کی تاریخ بڑی مشکل سے بنتی ہے۔ اسے بگاڑنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔
اس امر پر اتفاق رائے کے بعد وہ لوگ میجر تمکین تاج کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔
حسن امام اور تمکین تاج کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد مصطفےٰ کمال اور میجر فیروز خان میس چلے گئے۔ جھرنا کھانا لگا رہی تھی' اندر داخل ہوتے ہی تمکین تاج نے شکایتی لہجے میں ساری بات جھرنا کو کہہ سنائی۔ وہ اپنی روایتی محبت اور خلوص کے تحت بھڑک اٹھی۔
"آپ ہمارے بھائی ہیں۔" اس نے حسن امام کو مخاطب کیا۔ "اور اپنی بہن سے اس قسم کے فرار کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ لوگوں نے وعدہ کیا تھا کہ پورے ایک ماہ تک آپ ہمارے ہاں مقیم رہیں گے۔ اور ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے کہ آپ کو اپنا گھر یاد آنے لگا۔" منزہ اور حسن امام بوکھلا کے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔
ایک طرف خلوص کی انتہا تھی۔ تو دوسری طرف بے وفائیوں کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ دوسرے دن کے اخبارات کی نمایاں سرخیاں یہ اطلاعات لائی تھیں کہ رات ایک بنگالی پریس کانفرنس میں بریگیڈیر سراج نے فوج سے قطعی لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے نادر گئی الدین کی سیاسی پارٹی "جیے بنگال" میں شمولیت کا اعلان کیا تھا۔
بریک میں میجر تمکین تاج نے نہایت رازداری سے بریگیڈیر خلیل الرحمان شعلہ سے کہا۔
"یہ شخص ہمارے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے سر! اس نے فوج میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ "جیے بنگال" جیسی تنظیم کو مضبوط کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرے گا۔ ہمیں بہت کچھ سوچنا ہو گا۔"
"یقیناً۔" بریگیڈیر خلیل نے تمکین تاج کی تمام باتوں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہم فکر نہ کرو تمکین تاج۔ ابھی ہم اتنے کمزور نہیں ہوئے۔ ان شاء اللہ ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ مذاکرات پہلا راستہ ہے اور جنگ آخری اور اگر خدانخواستہ ہم کامیاب نہ ہوئے تو پھر شاید تاریخ بدل بھی سکتی ہے۔"
"یہ صرف خدشات ہیں سر!" تمکین تاج نے بڑے وثوق سے کہا۔ "ہم اور آپ ایک ہیں سر! اور ہمیشہ ایک رہیں گے۔"
"ان شاء اللہ۔" بریگیڈیر خلیل نے کہا۔
"سر! اس ویک اینڈ پر ہم سب جناب قمرالدین قاضی صاحب کے ہاں دعوت پر مدعو ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوں۔" میجر تمکین تاج نے کہا۔
"سوچ لو۔" بریگیڈیر خلیل نے جواباً کہا۔ "اگر مجھے شامل کر لیا گیا۔ تو پھر تم سب اپنا روایتی شور و ہنگامہ نہیں کر سکو گے۔"
"کوئی بات نہیں سر۔" میجر تمکین تاج نے کہا۔ "ہمیں آپ کی شمولیت سے خوشی ہو گی۔"



اس ویک اینڈ کی شام خوشگوار تھی۔ قمرالدین قاضی صاحب کے ہاں دعوت کے انتظامات مکمل تھے۔ جھرنا بھابھی تو صبح ہی سے ان کے ہاں موجود تھیں اور تمام تر امور میں ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ قمرالدین قاضی صاحب نے اپنی فطری سنجیدگی کے ساتھ اپنی لاڈلی بیٹی ڈاکٹر سنبل عرف بیا کو انتہائی فراخ دلی کے ساتھ دعوت کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ شاہ زمانی بیگم پہلے تو بے حد پریشان ہو گئیں۔ لیکن اب قدرے مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔ چونکہ ممتاز عرف مستی اپنی نانی اماں کے ہاں چٹاگانگ گیا ہوا تھا۔
علاوہ ازیں ایک خوشگوار پیش رفت یہ ہوئی تھی کہ میجر حسن امام' منزہ' میجر مصطفےٰ کمال' جھرنا اور میجر تمکین تاج نے باہمی مشاورت کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ آج اس دعوت کے موقع پر جناب قمرالدین قاضی صاحب سے عزیزم کیپٹن شاہ پال کو فرزندی میں لینے کی اپیل کی جائے گی اور اس امر کو یقینی بنایا جائے گا کہ کم از کم آنے والے موسم بہار تک اس "نوک" کے سرے کے پھول ضرور کھل جانے چاہئیں۔ ناکہ بے چارہ بلاوجہ سرد گرم آہیں بھرنے سے بچا رہے۔ یہ تو بعد کی بات تھی۔ لیکن اچانک جھرنا کو جیسے کوئی بڑی اہم بات یاد آگئی۔ اس نے کچن میں کام

کرتے ہوئے بیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"واہ! ہمارا ابھی کیا دماغ ہے بیا! امام بھیا سے ان کی سالیاں ہونے کی حیثیت سے "نیگ" لینا تو بھول ہی گئیں۔"

"ارے ہاں!" بیا نے فوراً کہا۔ "ہمیں ان کی آمد کی خوشی میں یاد ہی نہ رہا۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ کون سی بات مس ہو گئی ہے۔ چلیں آج شام ہی وصول کر لیں گے۔"

"بالکل۔" جھرنا نے تائید کی۔

"تمہارے بارے میں بھی بات تو دل چسپ ہے۔ جب دل چاہا' بہن بن گئے اور جب دل چاہا' سالی کا رشتہ بنا لیا۔ یعنی ہماری تو دونوں طرف سے رشتے داری بنتی ہے۔"

"بالکل بنتی ہے۔" ڈاکٹر بیا نے کہا۔

"بیا!" جھرنا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ان خوب صورت قسم کی رشتہ داریوں کے بیچ آج ایک نئی رشتے داری بھی قائم ہونے والی ہے۔"

"جی آپی! میں کچھ سمجھی نہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا اور تب گزشتہ روز کی جانے والی مشاورت کو راز میں رکھنے اور ڈاکٹر بیا کو اچانک سرپرائز دینے کا وعدہ توڑتے ہوئے جھرنا نے صاف صاف بتایا۔

"آج شام ہم لوگ قاضی صاحب سے باقاعدہ طور پر [illegible] تمہارے رشتے کے لیے بات کریں گے۔ اور درخواست کریں گے کہ وہ کیپٹن شادباب کے حالات پر رحم فرماتے ہوئے ہماری التجا قبول کریں۔" ڈاکٹر بیا کے چہرے پر شفق کی لالی پھیل گئی۔ پلکیں جھک گئیں۔ اور دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔

"آپی۔" اس نے لرزتے ہونٹوں سے سوال کیا۔ "کیا ایسا ممکن ہے؟"

"بالکل ممکن ہے۔" جھرنا نے وثوق سے جواب دیا۔ "مشرقی اور مغربی پاکستان کا یہ سنگم بے حد حسین ہوگا۔"

"مجھے ممی کی طرف سے خطرہ ہے۔" ڈاکٹر بیا نے اپنے خدشہ کا اظہار کر ہی دیا۔

"ارے وہ؟ وہ تو کچھ ہے۔" جھرنا نے ہنس کر کہا۔ "ہم اسے سمجھائیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو گئی۔

ٹھیک سات بجے مہمانوں کی آمد ہوئی۔ قاضی صاحب اور شاہ زمانی بیگم استقبال کے لیے آگے بڑھے۔ مہمانوں نے اندر آنا چاہا۔ لیکن برآمدے میں موجود جھرنا اور بیا نے ان کا راستہ روک لیا۔

"آپ لوگ اس طرح اندر نہیں جا سکتے۔" جھرنا نے اونچی آواز میں کہا۔

"تو پھر بھلا اور کس طرح جا سکتے ہیں؟" منو اور حسن امام کے پیچھے کھڑے مصطفی کمال نے سوال کیا۔

"ہمیں آپ سے نیگ لینا تو یاد ہی نہیں رہا۔" جھرنا نے کہا۔ "امام بھائی ہم دونوں آپ کی سالیاں ہیں۔ پہلے ہمیں نیگ دیں۔ پھر آپ اندر جا سکتے ہیں۔"

"نیگ؟" مصطفی کمال حیرت سے پوچھنے لگے۔ "بھلا یہ کیا بلا ہے؟"

"خواتین کی زبان میں نیگ اس رقم کو کہا جاتا ہے۔ جو گھر کے اندر داخل ہونے سے پہلے دولہا اپنی سالیوں کو بطور نذرانہ پیش کرتا ہے۔" جھرنا نے وضاحت کی۔

"اور مردوں کی زبان میں اسے "جگا ٹیکس" کہا جاتا ہے۔" مصطفی کمال بولے۔ "بہرحال ہم دینے کو تیار ہیں۔

فرمائیے کتنی رقم پیش کریں؟"

"کم از کم چار ہزار۔" جھرنا نے کہا۔

[illegible] مصطفی کمال نے کہا۔ "ہم تو صرف دو سو روپے دے سکتے ہیں۔"

"چلیے اتنے ہی دے دیجیے۔" بیا نے کہا تو جھرنا نے سخت احتجاج کیا اور بیا نے تو فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے۔ بہرحال۔ نوٹ اپنی اپنی مٹھی میں سمیٹ کر وہ بہت جلدی میں اندر چلی گئیں۔ اور جب حسن امام' منو کے ساتھ دروازے تک پہنچے تو وہ سرخ رنگ کا دوپٹہ تان کر دوبارہ ان کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔

"اب کیا ہے؟" میجر تمکین تاج نے پوچھا۔

"اب ہم بہنیں ہیں۔" جھرنا نے جواباً کہا۔ "امام بھائی ہمیں نیگ دیں گے۔"

"یہ کیا آپ لوگوں نے جگہ جگہ چنگی لگائی ہوئی ہے۔" مصطفی کمال نے کہا۔ "برائے مہربانی اندر جانے دیں۔"

"پہلے ہمارا حصہ اور نذرانہ۔" جھرنا کہہ رہی تھی۔

"قسم سے جواب نہیں' ہماری بہنوں کا بھی جواب نہیں۔" مصطفی کمال مسکرائے "مشرقی پاکستان ہو یا مغربی

پاکستان ہر جگہ ایک ہی قسم کا مزاج ہے۔ جارحانہ یا پھر تھانے دارانہ۔ بھائیوں کے سر پر سوار ہو کر اپنا حصہ لینا خوب جانتی ہیں۔"

"ہم آپ کے لیے مغربی پاکستان سے لائے گئے تحائف پیش کریں گے۔" منزہ نے کہا۔ "اور نیگ بھی ضرور ملے گا۔"

"نیگ تو ہم اسی وقت وصول کریں گے۔" ڈاکٹر ریا نے کہا۔ اسی وقت کیپٹن شاہ پال کی آمد ہوئی تو مصطفےٰ کمال نے آواز دے کر کہا۔

"ادھر آؤ بھئی۔ ذرا نیگ دے کر ہماری جان چھڑاؤ۔"

"نیگ؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔ "یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

"یہ ہوتی نہیں بلکہ ہوتا ہے۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔

"اور کیا ہوتا ہے؟ یہ تمہیں کچھ عرصے کے بعد پتہ چلے گا۔"

"آپی پلیز! اتنی زیادہ بد اخلاقی کا مظاہرہ نہ کریں مہمانوں کو اندر تو آنے دیں۔" کومل نے احتجاج کیا۔

"آپ لوگ دروازے پر کھڑے کھڑے اتنے طویل مذاکرات نہ کریں۔ بہتر ہے کہ اندر چل کر بیٹھیں اور بات کرلیں۔" قاضی صاحب بھی بول پڑے۔

"اب "بات" نہیں ہوگی سرا" مصطفےٰ کمال نے کہا۔ "مسئلہ ہماری آن اور عزت نفس کا ہے۔ اب تو نیگ ملا ہی ہوگا۔" خوشیوں اور قہقہوں کے سنگ رات کے رنگ بکھر گئے۔ قمر الدین قاضی۔ شاہ زمانی بیگم، کومل اور ریا کا خلوص دیکھ کر مصطفےٰ کمال بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے آہستہ سے شاہ پال کے کان میں سرگوشی کی۔

"معاف کرنا یار! میں شاید تمہیں بلاوجہ ہی یہاں آنے سے ٹوکا کرتا تھا۔"

جب محفل سج چکی۔ تو خواتین نے باقاعدہ طور پر پہلے نیگ وصول کیا۔ بعد ازاں تحائف کے پیکٹ دیکھ کر بے پایاں خوشی کا اظہار کیا گیا۔ حسن امام کی اماں جانی اور بہنوں نے خواتین کے لیے ریشمی سوٹ بطور تحفہ بھجوائے تھے۔ قاضی صاحب کے لیے جناح کیپ اور شیروانی کا کپڑا اور مستی کے لیے کراچی سے بنایا گیا پاکستان کا پرچم فریم شدہ تصویر کی صورت میں حسین رنگوں کے ساتھ بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس گراں قدر تحفے کو دیکھ کر شاہ زمانی بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"میرے بچے نے اس پرچم کی قدر کرنا چھوڑ دی۔" وہ دکھی لہجے میں بولیں۔ "جانے کن دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔"

"مجھے دے دیں ممی۔" کومل نے ہاتھ بڑھا کر یہ تحفہ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ "میں اپنے کمرے میں لگاؤں گی۔" گوجرانوالہ سے مصطفےٰ کمال کی بہنوں نے کھڈی سلک کی ساڑھیاں کشمیری شالیں اور چوڑیوں کا تحفہ بھیجا تھا۔ محبت کے یہ تحفے پا کر جھرنا۔ ریا، کومل اور شاہ زمانی بیگم کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"ہم اکٹھے جینا چاہتے ہیں۔" شاہ زمانی بیگم کہہ رہی تھیں۔ "اور ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" پھر انہوں نے اپنی طویل نظم "وطن کے نام" سنائی۔ جس میں وفاؤں کا عہد تھا۔ اور خلوص کی آواز تھی۔ اور وطن سے وفا نبھانے کا سبق بھی۔ قمر الدین قاضی صاحب کے گھر کی فضا نہایت جذباتی ہو چلی تھی کہ اچانک میجر فیروز خان تشریف لے آئے۔ اپنا مخصوص درویشانہ انداز لیے ہوئے وہ ہر ایک سے جھک کر ملے۔ خصوصی طور پر اس دعوت میں شریک کرنے کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے انہوں نے نیگ کی وصولی کے سلسلے میں ہونے والی واردات کا تذکرہ سنا اور پھر حسن امام سے جرح کرنے کے انداز میں پوچھنے لگے۔

"اور تم نے یہ نذرانہ پیش کردیا۔"

"یہ کیا کرتا بھئی۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔ "آپ تو خود بہنوں والے ہیں اور بخوبی جانتے ہیں کہ یہ مخلوق کتنی زبردست ہوتی ہے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔" فیروز خان نے کہا۔ "پھر بھی میرا ایمان ہے کہ بخششیں اور نذرانہ وغیرہ دینے سے پہلے ہزار بار سوچنا چاہیے۔ آپ لوگوں نے بلا سوچے سمجھے دے دیا۔ چچا غالب نے غالباً" آپ ہی جیسے لوگوں کے لیے کہا تھا۔

بیوقوفوں کی کمی نہیں غالب
ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

"اچھا یہ بتاؤ کہ بہنوں نے تمہیں سلامی کتنی دی۔" انہوں نے پوچھا۔

"فی الحال تو کچھ نہیں۔" حسن امام نے کہا۔

"پھر تو یہ شعر آپ پہ صحیح فٹ بیٹھتا ہے۔ بھئی عجیب لوگ ہیں آپ بھی۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ نیگ اور سلامی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

شاہ زمانی بیگم، ریا اور کومل کے ساتھ اندر سے آئیں اور جھرنا کے ساتھ بیٹھی ہوئی منزہ کو اپنی طرف سے سونے کا سیٹ پیش کیا۔

"یہ تو بہت قیمتی تحفہ ہے۔ ہمارے لیے تو آپ کا خلوص ہی کافی ہے۔"

"آپ ہماری بہو ہیں اور بیٹی بھی۔" قمر الدین قاضی صاحب نے کہا۔

"ڈاکٹر ریا! کیا ہمیں کوئی سیٹ ویٹ پیش نہیں کیا جائے گا۔ یہ ملن کروانے میں ہمارا بھی بہت بڑا کردار ہے۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔

ڈاکٹر ریا مسکراتی رہی اور میجر فیروز خان کو جیسے کچھ یاد آگیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔" وہ حسن امام سے مخاطب ہوئے۔ "یہ کیپٹن شاہ پال اور مصطفےٰ کمال کی جوڑیاں کب تک مبارک ہوں گی۔"

"ایک کے لیے تو آج ہی بات کی جائے گی۔" حسن امام نے جواب دیا۔ "اور دوسرے بے چارے کو تو اگلے چھاگن تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

تب ہی قمر الدین قاضی صاحب کوئی ضروری ٹیلیفون سننے کے بعد واپس آئے اور گفتگو کا رخ فلسطین کی تعلیمی نظام کی طرف ہو گیا۔ تو یہ بات سامنے آئی کہ پروفیسر روشن خیال کی طرف سے چلائی گئی نام نہاد آزادی کی تحریک میں طلبا نے تو ان کا ساتھ دیا ہے۔ لیکن طالبات اس صورت حال سے بے حد پریشان ہیں۔

اسی ماحول میں احباب نے جناب قمر الدین قاضی اور شاہ زمانی بیگم سے ڈاکٹر ریا کے لیے بات کی تو ایسا احساس ہوا۔ کہ وہ اس پروپوزل کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ روایتی جملوں کو بار بار دہرانے کے بجائے عندیہ دے دیا گیا۔

کیسی خوب صورت رات کا سماں تھا۔ اپنوں سے دور اپنے دیس میں وہ اپنے پیارے عزیزوں کی طرح ایک دوسرے کو گلے لگا کر مبارک باد دے رہے تھے۔ کومل نے اس خوشی میں فرمائش کی۔

"فیروز بھائی! اس موقع کی مناسبت سے بھی ایک شعر ہو جائے۔"

"شعر تو موجود ہے۔" وہ بولے۔ "لیکن ہے پنجابی زبان میں۔ کیا آپ لوگ سمجھ جائیں گے۔"

"ضرور، ضرور۔" اس نے جواب دیا۔ "اب تو ہمیں آپ کی اور آپ کو ہماری زبان سمجھنی پڑے گی۔ آخر کار رشتے داری کا معاملہ ہے۔"

"تو پھر شعر عرض کیا ہے۔" وہ بولے۔

سوہا چولا سیا ای۔ جیوندا رہ ڈھولا
رج کے کھچل کیتا ای

جھرنا کے اصرار پر کیپٹن شاہ پال نے شاعری کے اس بے مثال نمونے کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا۔ تو سنجیدہ مزاج قاضی صاحب بھی مسکرانے لگے۔

رات بھیگ رہی تھی۔ شرکاء کے اصرار پر کومل نے ستار پر کئی ایک مشہور نغموں کی دھنیں سنائیں۔ اہل محفل محو تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور مستی اندر آگیا۔ وہ ایک پل ٹھہر کر آگے بڑھا اور پھر بولا۔

"بہت خوب! یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟"

اس وقت اس کی آمد قطعی طور پر غیر متوقع تھی۔ شاہ زمانی بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے گئیں۔ محفل کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ چنانچہ شرکائے محفل نے اجازت چاہی۔ تو قمر الدین قاضی نے گویا التجا کی کہ کیپٹن شاہ پال اور ریا کی نسبت طے پا جانے کے بارے میں مستی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ یہ رازداری احتیاط کا تقاضا تھی کہ اس وقت بھی اس کی غصیلی آوازیں نیچے تک آرہی تھیں۔

"اگر ہم مستی جیسے جوشیلے نوجوانوں کی تحریک ہوش اور دلائل سے ختم نہ کر سکے۔ تو پھر کیا ہوگا؟" میجر سکین تاج نے پہلی مرتبہ اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"بات یہ ہے برادر عزیز! کہ ہم لوگوں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ انہیں چاہیے کہ ہماری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں اور یہی ان کے حق میں بہتر ہے۔" میجر فیروز خان نے کہا۔

"میں اکثر سوچتا ہوں۔" میجر سکین تاج نے کہا۔ "خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا۔ تو کیا ہم سب اپنے ہی دیس میں پردیسی ہو جائیں گے؟"

"اللہ نہ کرے۔" جھرنا نے فوراً کہا۔ "یہ آپ لوگ کیسی مایوسی اور ناامیدی کی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔"

"یہ شورش بڑھ رہی ہے بیگم صاحبہ۔" میجر سکین تاج نے کہا۔ "ہمیں شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبا کر یہ

نہیں سمجھنا چاہیے کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"اگر ٹھیک نہیں ہے۔ تو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔" جھرنا نے کہا۔ "آج کا دن اور رات کا یہ پہر بہت خوشگوار گزرا ہے۔ برائے مہربانی آپ ہمیں خوف زدہ نہ کریں۔"

"اس غریب نے آپ کو کیا خوف زدہ کرنا ہے؟" مصطفےٰ کمال بولے۔ "یہ تو بے چارہ خود آپ سے ڈرتا ہے۔ اور بحیثیت شوہر آپ کے ہر حکم کا تابع ہے۔ فکر نہ کریں۔"



رات بھیگ چکی تھی۔ سب ہی اپنی اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے اور خوابوں کا ایک جہان آباد تھا کہ مصطفےٰ کمال نے مرشد کو خواب میں دیکھا۔ سفید لباس میں ملبوس پیارے پاکستان کے پرچم کو ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ پھر یہ عظیم پرچم دو حصوں میں تقسیم نظر آیا۔ انہیں آسمان پر روشن چاند صاف دکھائی دیا۔ یک دم چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور ایک ٹکڑا سمندر میں گر گیا۔ مصطفےٰ کمال نے دیکھا کہ اب سمندر سرخ رنگ کا ہو گیا تھا۔

اچانک ان کی آنکھ کھل گئی۔

پسینے میں شرابور وہ اٹھ بیٹھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مومن کے لیے وقت خوف جائے نماز سے بہتر پناہ گاہ اور کوئی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے رب کے حضور سربسجود ہو گئے اور جائے سجدہ آنسوؤں سے تر ہو گئی۔



پانچ دن کے بعد ہی نیشنل فٹ بال اسٹیڈیم میں ہاکی میچ کے دوران مغربی پاکستان سے آئی ہوئی ضلع کی ٹیم کی ایک ٹیم نے سب پے درپے کئی گول کیے۔ تو شائقین میں سے کسی نے آواز لگائی۔

"اوئے پنجاب کی اکڑ مٹ گئی ہے۔" جواب میں کسی سرپھرے کھلاڑی نے آوازہ کسا۔

"ہم بھی تو چاولوں کی کھچ نکالنے یہاں آئے ہیں۔"

"غذائی عادات کی مناسبت سے کیا گیا یہ طنز اپنا کام کر گیا اور کھلاڑی آپس میں الجھ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا ہجوم گراؤنڈ کے اندر آ گیا۔ بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پانا مشکل ہو گیا اور پھر بنگال کی سرزمین پر پاکستانی پرچم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد جلا دیا گیا۔

یقیناً "اس کے بانی پاکستان کی روح کانپ اٹھی ہو گی کہ دبی چھپی ہوئی شورش اب پوری طرح سے سامنے آ چکی تھی۔"

اس لاء اینڈ آرڈر سچویشن کو کنٹرول کرنے کے لیے فوج طلب کر لی گئی۔ اور حالات نے عجب رنگ اپنا لیا۔ شورش کی اس اذیت ناک کیفیت میں منزہ حسن امام نے اپنی نئی زندگی کی شروعات کی۔ اب وہ دونوں روڈ پر واقع اپنی رہائش گاہ میں منتقل ہو چکے تھے۔ گھریلو زندگی کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ایک مسلسل انتظار منزہ کا نصیب بن چکا تھا۔ حسن امام صبح دفتر روانہ ہوتے تو وہ پوچھتی۔

"آپ کب تک واپس آئیں گے؟"

"کچھ معلوم نہیں۔" وہ جواب میں کہتے۔ "میرا انتظار نہ کرنا۔ کھانا وقت پر کھا لینا۔"

"ناممکن۔" وہ دو ٹوک جواب دیتی۔

"اب اس ناممکن کو کسی طرح ممکن بناؤ۔" وہ مسکرا کر کہتے۔ "بھئی فوجی کی بیگم ہو۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔"

بریگیڈیر سراج نے "مجھے بنگال" "میں شمولیت اختیار [illegible] مشرقی پاکستان [illegible] اقدامات نے [illegible] آگ میں ہر محب وطن پاکستانی جلنے لگا۔ سماجی [illegible] پرست لوگوں نے رابطے بحال رکھے۔ وسیع پیمانے پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ مغربی پاکستان سے پروفیسر اکرم قریشی صاحب ڈھاکہ پہنچے۔ مصطفےٰ کمال کی وساطت سے پروفیسر روشن خیال تک رسائی حاصل کی گئی اور جب ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ تو مارے حیرت کے ششدر رہ گئے۔

آج کا یہ پروفیسر روشن خیال کل کے اس شاہی سے کس قدر مختلف تھا۔ جو کالج کے سنہری دنوں میں ان کا روم میٹ دوست اور ہمدرد تھا۔ مشرقی پاکستان طویل فاصلے پر واقع ہونے کے سبب اکثر وہ عید الفطر اور عید الاضحی کی چھٹیوں میں اکرم قریشی صاحب کے ہمراہ گوجرانوالہ چلا جایا کرتا تھا۔ جہاں قریشی گھرانے کا ہر فرد اسے خوش آمدید کہتا۔ اور اماں بی صبح ناشتے میں اس کے لیے مکھن کے پراٹھے بنایا کرتیں۔

بانو بھی پوچھتی۔ "بھائی جان کیسا ہے مشرقی پاکستان؟"

"بہت خوبصورت اور وسیع۔ کبھی چلو ناں میرے

ساتھ۔" اور بلال بول پڑتا۔

"میں ضرور چلوں گا بھائی جان۔ سنا ہے کہ بنگالی فٹ بال بہت شوق سے کھیلتے ہیں۔ میں اپنے اسکول کی فٹ بال ٹیم کا کپتان ہوں۔ کبھی نہ کبھی میچ کھیلنے ضرور جاؤں گا۔"

لیکن آج کہاں تھا کل کا وہ شاہی؟ جو ایک مرتبہ ہاسٹل میں آگ لگ جانے کے سانحے میں بلا خوف و خطر اندر جا کر اپنے ساتھیوں کو جلتے ہوئے کمرے اور راہداری سے باہر نکال لایا تھا۔ جو اپنے دوست اکرم قریشی کے والد بزرگوار کی وفات پر رویا تھا۔ جس نے بانو اور بلال کے آنسو پونچھے تھے۔ جو ایک پنجابی استاد کو اس لیے اپنا محسن اور مربی مانتا تھا کہ انہوں نے ایک موقع پر اس کے تمام واجبات ادا کر کے ایک قیمتی سال ضائع ہونے سے بچایا تھا۔

تاریخ کے اس نازک موڑ پر اس نے ان یادوں کی سمت کھلنے والا ہر دروازہ اور ہر کھڑکی بند کر لی تھی۔ جب ہی تو برسوں بعد سامنا ہونے پر جب اکرم قریشی صاحب گرم جوشی کے ساتھ ملنے کے لیے آگے بڑھے تو ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پروفیسر روشن خیال نے سوال کیا۔

"آپ کون صاحب ہیں؟" اور اکرم قریشی صاحب گویا مٹی کے ڈھیر کی طرح ڈھے گئے۔

"شاہی۔" وہ حیرت کے ساتھ بولے۔ "میں ہوں اکرم قریشی تمہارا اکی تمہارا دوست تمہارا بھائی۔"

نہ تو آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی اور نہ ہی ذہن کے روشن آسمان پر یاد کا کوئی ستارہ چمکا۔ بے مہر موسموں کا سیلاب شناسائی کے سب دیے بجھا چکا تھا۔ ذہن کھنڈر تھا اور دل تاریک۔ کسی بھی جگہ پر پرانی یاد کی گلابی رت باقی نہ رہی تھی۔ لب ہلے اور میرا بھائی کہنے والی زبان نے کہا۔

"یہ اتنی لمبی گردان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سیدھی طرح اپنا تعارف کروایئے۔"

"میں تعارف کراؤں۔" وہ دکھ اور حیرت کے ساتھ بولے۔ "روشن خیال! کیا ہو گیا تمہیں؟"

"ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ بہتر ہے کہ آپ یہ سوال ہم سے کرنے کے بجائے اپنے آپ سے اپنے دل سے کریں۔"

اس موقع پر موجود میجر فیروز خان نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اکرم قریشی صاحب نے با آواز بلند کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر سنو پروفیسر روشن خیال! میں تمہارے ماضی کا اکی اور حال کا پروفیسر اکرم قریشی ہوں۔ جو آج تک یہ نہیں بھولا کہ اس کے ماضی میں شاہی نام کا ایک طالب علم اس کے ساتھ تھا۔ جو زندگی بھر اس کی یادوں کے سنگ سنگ چلتا ہوا آج کا وہ پروفیسر روشن خیال ہے۔ جو سب کچھ فراموش کر چکا ہے۔

اسے کچھ بھی تو یاد نہیں۔ نہ وطن نہ پرچم نہ پیار نہ وفائیں اور نہ ہی اس وردی کی آن عزت اور حفاظت جس پر کبھی وہ جان قربان کرنے کے دعوے کیا کرتا تھا۔

آج اتنا بدل چکا تھا کہ پرانی پہچان محبت دوستی اور بھائی چارے کو بھلا کر اس وقت قطعی طور پر اجنبی بن چکا تھا۔ "یہ کیسا تضاد ہے روشن خیال؟" اکرم قریشی صاحب کی آواز بھرا گئی۔ لیکن پروفیسر روشن خیال نے اسی قدر اجنبیت کے ساتھ کہا۔

"تضادات اور حادثات ایک دم بپا نہیں ہوتے۔ ان کے لیے اسباب اور واقعات بنتے ہیں۔ ان تمام عناصر کو مرتب کرتے آپ لوگوں نے نتائج کے بارے میں بھلا کیوں نہیں سوچا؟"

"ہم تو ہمیشہ آپ ہی کے لیے سوچتے رہے۔" اکرم قریشی نے کہا۔

"آپ ہی کی بہتری کے لیے کوشاں رہے۔ پھر بھی انجانے میں اگر کہیں پر کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ تو ہمیں معاف فرما دیں۔ ہمارا ماضی ایک تھا۔ ہمارا حال بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اور ان شاء اللہ مستقبل بھی۔ ہمیں اجنبیت کی مار نہ مارو روشن خیال! شاید یہ ستم ہم برداشت نہ کر سکیں۔ دیکھو، سوچو اور سمجھو ہماری تاریخ کیا کہتی ہے؟"

"تاریخ خواہ کچھ بھی کہے۔" پروفیسر روشن خیال نے سرد مہری سے کہا۔ "آپ لوگ یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لیں۔ کہ اب ہم تاریخ کا یہ جبر برداشت نہیں کریں گے۔"

"تاریخ کا یہ جبر کیا معنی رکھتا ہے؟" "کیا تمہیں اس کا احساس نہیں؟" اکرم قریشی نے سوال کیا۔ "ہمیں اور تمہیں آزادی جیسی نعمت ملی اور الگ وطن بھی۔ اگر یہ جبر ہے۔ تو پھر احسان کیا ہے؟"

"آزادی؟" پروفیسر روشن خیال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بہت خوب تو آپ لوگ اسے آزادی کہتے ہو۔ بہت ممکن ہے کہ یہ نعمت آپ لوگوں کو نصیب ہوئی ہو۔ ہمیں تو

صرف اتنا فرق پڑا کہ ہم ایک فریق کی غلامی سے نکل کر دوسرے فریق کی دسترس میں آگئے۔"

"پروفیسر روشن خیال۔" اکرم قریشی نے کہا۔ "ہم بغیر کسی تعارف کے یہ گفتگو کس حیثیت سے کر رہے ہیں؟ دوست، ہم وطن، ہم مذہب یا پھر اجنبی؟ نہیں روشن خیال! نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی آنکھ کھل جائے گی اور سب ہی کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ فقط ایک مفروضہ ہے۔" روشن خیال نے کہا۔ "اب کبھی بھی کچھ بھی کہیں پر بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ ہم بہت دیر کے بعد جاگے ہیں۔ ہمارا شعور بیدار ہو چکا ہے۔"

"اسے شعور نہیں شورش کہتے ہیں۔" اکرم قریشی نے کہا۔ "یہ شورش ہے جو اضطراب اور انتشار کی منزل سے شروع ہو کر تباہی پر ختم ہوتی ہے۔"

"ویسٹ پاکستان والوں کی اس دوغلی پالیسی کا بھی جواب نہیں۔" پروفیسر روشن خیال طنزیہ مسکرایا۔

"وہ اپنے حقوق طلب کریں تو بجا اور اگر ہم طلب کریں تو شورش۔ واہ صاحب واہ۔ یہی دوہرا معیار تو آپ کے بقول اس انتشار کا باعث بنا۔"

"اب بھی اگر آپ نے مجھے نہیں پہچانا تو کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کو بخوبی پہچان لیا ہے۔" اکرم قریشی نے کہا۔ "چلو مان لیا کہ اب ہم دوست نہ سہی۔ لیکن اجنبیوں کی سی حیثیت کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر مذاکرات تو کر سکتے ہیں۔"

"مذاکرات چہ معنی دارد۔" روشن خیال نے جواب دیا۔ "جغرافیائی خطے کے مسائل کا حل مذاکرات کی میز پر کبھی نہیں ملا کرتا۔ اس کے لیے جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ انقلاب لانا پڑتا ہے۔ سوری مسٹر اکرم قریشی۔ اب ہم نے ہر طرف سے اپنی جانب کھلنے والے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لی ہیں۔ اسی لیے آج کا مشرقی پاکستان ایک سلگتا ہوا آتش فشاں بن چکا ہے۔" اکرم قریشی نے کہا۔

"تم لوگ گھاٹے کا سودا کر رہے ہو۔ بہت پچھتاؤ گے روشن خیال۔ تم دوست تھے، بھائی تھے اور ہم وطن بھی لیکن یہ سب گزرے ہوئے کل کی باتیں تھیں۔ اب احساس ہوا کہ ہمارا آج ہمارے کل سے کتنا مختلف ہے۔"

"اس آج کو کل سے مختلف کرنے میں آپ ہی لوگوں کا ہاتھ ہے۔" پروفیسر روشن خیال نے کہا۔ "اور سوری محترم جناب پروفیسر صاحب میں آپ کا ہم وطن نہیں ہوں۔ اگر آپ ایسا سمجھتے تو آپ کے سرکاری وفود واپس مغربی پاکستان جا کر ہماری شکایات نہ لگاتے۔ بریگیڈیئر سراج کو استعفیٰ نہ دینا پڑتا۔ ہمارے حقوق غصب نہ کیے جاتے۔ ہمارے میرٹ پر دوسروں کو ترجیح نہ دی جاتی۔"

"مسائل کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا ابھی ختم نہیں ہو جاتی۔ آؤ آج بھی موقع ہے کہ ہم تمام رنجشیں بھلا کر ایک ہو جائیں۔"

"ناممکن، قطعی ناممکن۔" روشن خیال نے چبا کر کہا۔ "اب تو انقلاب کے راستے کھل چکے ہیں۔ ہم نے اپنے راستے کا تعین کر لیا۔ سوری اب ہم اکٹھے کہیں چل سکتے۔"

یک دم اک سناٹے کی کیفیت ہر طرف چھا گئی۔ ایک ایسا وحشت زدہ سناٹا۔ جو کسی بھی طوفان کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔

"ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ بات اتنی دور تک پہنچ چکی ہے۔" اکرم قریشی صاحب نے مایوسی سے کہا۔ "بات جب اجنبیت اور پہچان کی حد سے نکل کر انقلاب تک آن پہنچی تو پھر مذاکرات کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ ہم دوستی اور بھائی چارہ چاہتے ہیں [illegible] روشن خیال! آؤ بہت اچھے بھائیوں کی طرح گلے لگ جاؤ۔"

"یہ تو سعی لاحاصل ہے پروفیسر صاحب۔" روشن خیال نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ہم آپ کو گلے لگانے کے لیے ہی تو آگے بڑھے تھے۔ لیکن آپ لوگوں نے ہمارے گلے کٹوانے کا پروگرام بنا لیا۔ اب جبکہ ہم نے اپنی زندگی خود جینے کا ارادہ کر لیا۔ تو آپ لوگ ہمیں یہ سمجھانے چلے آئے ہیں۔"

"اگر ایسا ہونا ممکن نہیں روشن خیال۔" اکرم قریشی نے کہا۔ "تو پھر مجھے بتاؤ کہ اس پرچم کا کیا بنے گا؟ جو ہمارے تمہارے بزرگوں نے مل کر بلند کیا۔ اس تقسیم کا کیا ہوگا؟ جو ایک تحریک کی صورت ابھری اور ایک حقیقت بن گئی۔ اس وردی کا کیا ہوگا۔ جو ان سب نے ایک ساتھ زیب تن کرتے ہوئے وطن سے وفا نبھانے کی قسم کھائی۔ ان وعدوں کا کیا بنے گا؟ جو ان لوگوں نے اپنی مقدس الہامی کتاب پر کیے۔ کیا اب راستہ بدل لینے کا عزم کر لینے کے بعد اس سفر ہجر و وصال کی وحشتیں ہمارا نصیب بن جائیں گی؟ اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر آؤ پروفیسر روشن خیال!

وفاؤں اور وعدوں کی موت کے اس المناک المیے پر ہم اور تم مقدر کے لکھے پر سر رکھ کر رو دیں۔"

پروفیسر اکرم قریشی کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ روشن خیال پتھر کا بت بنے سامنے بیٹھے رہے۔ بہت گہری خاموشی نے ماحول کا گھیراؤ کر لیا کہ اچانک میجر فیروز خان نے حالات کی مناسبت سے شعر پڑھا۔

میں تو سمجھا تھا کہ انمول ہے زیست تیری
تو بکا ہوا سودا ہے مجھے معلوم نہ تھا

میجر مصطفےٰ کمال اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔" میجر فیروز خان نے تائید کی۔

"خدا حافظ میرے مہربان دوست۔" اکرم قریشی نے پروفیسر روشن خیال سے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے "بنگالی بھائیوں" نے فٹ بال کھیلتے کھیلتے بال دشمن کے کورٹ میں ڈال دی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب کا حامی و ناصر ہو (آمین)۔"

پروفیسر روشن خیال کچھ نہ بولے۔ اکرم قریشی، میجر مصطفےٰ کمال اور فیروز خان کے ہمراہ ان در و دیوار سے باہر آ گئے۔ جو اب اجنبی ہو چکے تھے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

پروفیسر اکرم قریشی صاحب دوسرے ہی دن مایوسی کے عالم میں واپس چلے گئے۔



ایسے ہی صدمات کے زیر و بم میں زندگی جیسے ایک کشمکش کے عالم میں گزر رہی تھی۔ ڈھاکہ کے کرمی ٹولہ کنٹونمنٹ میں میجر سکین تاج کا گھرانہ وفاداری اور خلوص کی علامت تھا۔

ہر دوسرے ویک اینڈ پر میجر سکین تاج اور جمیرا بھابھی اپنے ہم وطنوں کو مدعو کرتے۔ مختلف قسم کے شکوک و شبہات اور تشویش کا اظہار کرنے پر اپنے دوستوں کو تسلی دیتے۔ ان کا خیال ہی نہیں بلکہ ایمان تھا کہ یہ شورش دب جائے گی۔ وہ اکرم قریشی صاحب کے مایوس لوٹ جانے پر افسردہ تھے۔

بات اب مذاکرات اور مذاکرے کی سطح سے بلند ہو کر دو ٹوک فیصلے کی فصیل کو عبور کرتے ہوئے میدان میں آمنا سامنا ہونے تک آن پہنچی تھی۔

جمعۃ المبارک کا مقدس دن تھا۔ جب جیسے بنگال نے پہلی مرتبہ ہڑتال کی کال دی اور زندگی کا سارا انتظام معطل ہو گیا۔ مسجد بیت المکرم میں خطبے کے دوران مولانا محترم نے سیاسی رنگ بھرا تو پہلی صف میں موجود میجر فیروز خان اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور با آواز چلا اٹھے۔

"یہ خدا کا گھر ہے۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ اسے سیاست کا گڑھ نہ بناؤ۔"

بات تو بالکل درست تھی۔ لیکن ہنگامے کا رخ اختیار کر گئی۔ نمازی اپنا فرض بھول کر کھلم کھلا پاکستانی فوجیوں کے خلاف نعرہ بازی کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا گیا۔ سول انتظامیہ کو چار و ناچار فوج کی مدد طلب کرنی پڑی اور ایک خوف و دہشت کا سماں ہر طرف چھا گیا۔

بہار کی اولین رت تھی۔ لیکن سبز پتوں پر خزاں کا رنگ چھا گیا۔ ڈھاکہ کے کرمی ٹولہ کنٹونمنٹ پر اداسی کا احساس نمایاں تھا۔ کیپٹن شاہ بال میس کے کمرے سے باہر نکلا۔

آج دل بہت اداس تھا۔

بہت دور بستی میں رہنے والی بے بی زینب اور گل یاد آ رہی تھیں۔ غلام رسول پرسوں ہی واپس آیا تھا۔ اس کے بقول بے بی جی ہر شام دروازے کی طرف اسی آس میں دیکھتی رہتی تھیں کہ شاید رات کا اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے شاہ بال واپس آ جائے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ بے بی گزشتہ برسات میں بہت بیمار رہیں۔ انہوں نے یہ پیام بھیجا تھا کہ "اب جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ بس اب تم جلدی سے آ جاؤ۔"

اور وہ بذات خود بھی تو بہت جلدی جانا چاہتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر ثریا کو مہر و وفا کی انگوٹھی پہنانے کے بعد بے شک اسے قمرالدین قاضی صاحب کی زبان پر اعتبار تھا۔ لیکن موجودہ حالات کے سبب وہ چاہتا تھا کہ بات ڈھکی چھپی نہ رہے۔

آج بہت دنوں کے بعد اس کے قدم ڈاکٹر ثریا کے گھر تک جا پہنچے۔ ویک اینڈ کی شام میں بھی اک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جب کال بیل کے جواب میں باہر کوئی نہیں آیا۔ تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پورچ میں جا کھڑا ہوا۔ سامنے کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

کچھ دیر تک سوچنے کے بعد وہ واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک کوئی باہر نکلی۔ شاہ بال پر نظر پڑتے ہی مسکرا کر بولی۔

"ارے۔ بھائی صاحب آپ؟"

"بہت دنوں کے بعد تشریف لائے ہیں۔ آیئے بیٹھیے ناں میں چائے بناتی ہوں۔"

کسی مقناطیسی طاقت کے تحت وہ کھنچا ہوا اندر چلا آیا۔ کومل اس کی سوالیہ نگاہوں کو ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگی۔

"آپی، ممی اور پاپا آج صبح جناح کانگ چلے گئے ہیں۔ نانی اماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کل ان شاء اللہ واپسی ہو گی۔" وہ کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے مرکزی نشست پر بیٹھ گیا۔ کومل کچن میں چلی گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ قدرت نے اس گھر کو آرزوؤں کا مرکز تو بنا دیا۔ خدا جانے تکمیل بھی نصیبوں میں ہے یا نہیں۔

کومل چائے بنا کر لے آئی۔ "بھائی صاحب۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مایوس لہجے میں بولا۔ "بس یونہی آج دل بہت اداس ہے۔"

"لگتا ہے۔ بہت دنوں سے آپی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی اور پھر حالات بھی تو یک دم اتنے زیادہ بگڑ گئے ہیں۔"

"ان حالات ہی کی وجہ سے تو پریشانی ہے۔" وہ بولا۔

"اللہ پاک رحم کرے گا۔" کومل نے تسلی دی۔ "آپ چائے پئیں۔ میں ابھی ستار پر آپ کو ایک زبردست دھن سناتی ہوں۔"

"کومل۔" اس نے آزردہ آواز میں کہا۔ "کیا تم قومی ترانے کی دھن بجا سکتی ہو۔"

"کیوں نہیں بھائی صاحب۔" وہ یقین سے بولی۔

وہ کونے میں پڑا ستار اٹھا کر لے آئی اور سامنے فرشی نشست پر بیٹھ کر اس نے تار چھیڑے۔ اس کی لانبی مخروطی انگلیاں تاروں کو چھوتی رہیں اور شام کے اس اداس سے قومی ترانے کی دھن سنائی دینے لگی۔

پاک سرزمین شادباد۔ کشور حسین شادباد۔

اک محویت کے عالم میں یہ دھن سنتے ہوئے وہ قومی ترانے کے احترام میں خاموش کھڑا تھا کہ یکدم بادلوں کی گرج کے ساتھ بجلی چمکی۔ مرکزی دروازہ زور سے بجا اور وحشت کے لمحات در آئے۔ گرجتی ہوئی آواز ہر طرف پھیل گئی۔

"کومل! یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے؟" ستار کے بجتے ہوئے تاریک دم خاموش ہو گئے۔ ماحول پر چھایا ہوا سحر ٹوٹ گیا۔

کومل گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مستی گھر کے اندر آ چکا تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ جوشی بھی بہکے ہوئے قدموں سے ساتھ اندر آ چکا تھا۔ وہ دونوں اپنے حواسوں میں نہیں تھے۔ ان کے لہجے میں نشے کا رنگ بول رہا تھا۔

"واہ کیا بات ہے کپتان صاحب۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "ساری دنیا کو تو آپ لوگ اخلاقیات کا سبق دیتے ہیں اور خود دوسروں کے گھروں میں بلا اجازت گھس کر محفلیں سجانے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں آپ کس کی اجازت سے یہاں آئے ہیں۔" کیپٹن شاہ پال نے نہایت صبر و سکون سے اس کی بات سنی اور پھر مطمئن انداز میں بولا۔

"اپنے دل کی اجازت سے!"

مستی کو غالباً اس جواب اور اس رویے کی توقع نہ تھی۔ وہ تلملا اٹھا۔

"واہ صاحب واہ۔ جواب نہیں آپ کے دل کا بھی۔ وہ تو ہمارے وطن کی وراثت کا بھی تمنائی ہے۔ تو کیا آپ کے دل کی تمنا پوری کرنے کے لیے ہم اپنے گھروں کو تماشا گاہ بنا دیں گے؟"

"تماشا گاہ تو آپ نے بنا رکھا ہے۔" کیپٹن شاہ پال نے کہا۔ "قومی زندگی میں بلا وجہ شورش برپا کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ آپ اپنی قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔"

"اب اس زعم میں مت رہنا کیپٹن شاہ پال کہ تم لوگ طاقت کے بل بوتے پر ہمیں دبا لو گے۔ خوب اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔ ہماری تحریک کا آغاز ہو چکا ہے۔ بہت جلد تم سب دیکھو گے کہ ہمارا الگ پاسپورٹ ہو گا اور الگ پرچم۔"

"تم بھول رہے ہو مسٹر قاضی۔" کیپٹن شاہ پال نے نہایت تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ "پاسپورٹ اور پرچم الگ کرنے کے عزم کو تحریک نہیں۔ بلکہ غداری کہا جاتا ہے اور ایسا ان شاء اللہ ہم ہونے نہیں دیں گے۔"

"واہ کمال بات کی جناب کپتان صاحب آپ نے۔" وہ تالی بجا کر ہنسا۔ "اگر یہ غداری ہے۔ تو پھر آپ اس تحریک کو کیا نام دیں گے۔ جس کے نتیجے میں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی؟"

"وہ ایک قوم کا مسئلہ تھا۔ مسلمان قوم کو ایک حیثیت اور شناخت دینے کی تحریک تھی۔" شاہ پال نے کہا۔

"اور آپ بھول رہے ہیں کہ یہاں بھی مسئلہ تو اپنی الگ شناخت اور پہچان کا ہے۔ آپ لوگ اسے تسلیم نہ کریں تو آپ کی مرضی۔"

"مسٹر قاضی۔" کیپٹن شاہ پال نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔ "آج ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے ہماری پہچان اقوام عالم پر عیاں ہے۔ اب اگر آپ اسے تسلیم نہ کریں تو یہ آپ کی مرضی ہے۔ اب اگر آپ لوگ اسے بھول کر نئے سرے سے اپنی پہچان کروانے کا عزم رکھتے ہیں۔ تو پھر یاد رکھنا۔ یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔"

"ہم تو پہلے بھی خسارے میں ہی جی رہے ہیں۔" مستی چلایا۔

"آج تک ہم پر جو مظالم روا رکھے گئے ہیں۔ ان کے نتیجے میں ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔"

"یہ مظالم کی خود ساختہ داستان ہے۔" کیپٹن شاہ پال نے کہا۔ "یہ خود ترسی ہے۔ آپ کے حقوق اتنے غصب نہیں ہوئے۔ جتنا کہ آپ شور مچا رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ غیروں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے بجائے۔ آؤ ہمارے ساتھ ہاتھ ملاؤ۔"

"یہ کبھی نہیں ہو گا۔" وہ بولا۔ "ہمارے پٹ سن کو لوٹ کر بہت مزے کر لیے آپ سب نے۔ اب یوم حساب آن پہنچا ہے۔ تو بھاگنے کی تیاری کر رہے ہو۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔" کیپٹن شاہ پال نے اونچی آواز میں کہا۔ "اگر یہ تمہاری انا اور ضد کی جنگ ہے۔ تو پھر اتنا ضرور یاد رکھنا کہ جغرافیائی یا پھر مخصوص حالات کے برعکس ہم کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کریں گے۔"

"شکست تو اب تمہارا مقدر ہے مسٹر شاہ پال۔" مستی نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ اسے تسلیم کرو یا نہ کرو۔ یہ تمہاری مرضی ہے۔"

"معاف کرنا شاہ پال کیانی۔" مستی نے طنزیہ آواز میں کہا۔ "باکردار انسان غیروں کے گھروں میں اس طرح بلا اجازت اپنی شام گزارنے نہیں آتے۔"

"اگر آپ کے نزدیک میرا یہ طرز عمل غلط ہے۔ تو پھر اپنی جوان سگی بہن کی موجودگی میں اپنے اوباش شرابی دوست کو گھر کے اندر آنے کی اجازت دینا احسن عمل ہے۔" یہ نہایت تلخ سوال تھا۔ ممتاز قمرالدین قاضی اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ مارے غصے کے اس نے آگے بڑھ کر کومل کا ستار اٹھا لیا۔ وہ اسے چھیننے کی کوشش میں دوسری جانب گر پڑی۔ مستی نے ستار زمین پر دے مارا اور ستار کے تار ٹوٹ کر بکھر گئے۔

پاک سرزمین شاد باد کی نغمگی ٹوٹ کر ہر سمت بکھر گئی۔

"بہت ہو گیا وطن پرستی کا یہ ڈھونگ۔ خبردار اگر اب کسی نے میری مرضی کے خلاف سانس بھی لیا۔ تو میں اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اور تم......!" وہ کیپٹن شاہ پال کی طرف مڑا۔

"تمہارے لیے بہتر یہی ہو گا کہ تم آئندہ کبھی اس گھر کا رخ بھی نہ کرنا۔ ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

"میں جا رہا ہوں۔ لیکن کومل کو ساتھ لے کر۔ میں اسے جھرنا بھابھی کے گھر چھوڑ دوں گا۔ بے شک یہ تمہاری بہن ہے۔ لیکن معاف کرنا مسٹر ممتاز قاضی! میں تمہارے اوباش دوست کی موجودگی میں اسے یہاں چھوڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

مستی نے اس بات کے جواب میں ایک نظر جوشی پر ڈالی۔ جو اب مکمل مدہوشی کے عالم میں صوفے پر گرا پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ شاہ پال کی اس دلیل کا جواب تلاش نہ کر سکا۔ اور غصے سے پوچھنے لگا۔

"تم کیا لگتے ہو ہمارے؟"

"تم تو کوئی بھی دلیل یا رشتہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں ہو۔ پھر بھی اگر سن سکتے ہو تو سنو' تمام رشتوں سے بالاتر ایک رشتہ انسانیت اور دوسرا آدمیت کا بھی ہوتا ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ دوسری صورت میں تم بھی نتائج کے ذمہ دار خود ہو گے۔"

جوشی مدہوش پڑا رہا اور مستی خاموش کھڑا رہا جبکہ انسانیت' وطن پرستی' مذہب' ملت اور آدمیت کے بہترین اور معتبر حوالے سے کیپٹن شاہ پال کومل کا ہاتھ تھام کر باہر آ گیا۔

میجر تمکین تاج کے گھر تک دونوں خاموش رہے۔ لیکن آنسوؤں کی زبان شکریہ ادا کر رہی تھی کہ واقعی آج ایک بھائی نے اپنی بہن کی لاج رکھ لی تھی۔

کومل کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے ساری داستان کہہ سنائی۔ میجر تمکین تاج اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں بھی کہہ اٹھے۔

"میں اس کا سر توڑ دوں گا۔ بے حیا' بے شرم انسان!

سمجھتا کیا ہے خود کو۔" نرم گفتار جھرنا سمجھانے کے انداز میں کہتی رہی۔

"غصے سے حالات مزید بگڑ جائیں گے۔ مستی تو بچہ ہے۔ کیا آپ لوگ بھی ہوش و خرد کا دامن چھوڑ دیں گے۔"

رات اپنا سفر طے کرتے ہوئے کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ ڈنر ٹائم تو گزر چکا تھا۔ پھر بھی جھرنا نے کھانا لگایا۔ اور بصد اصرار پیش کیا۔ کومل میجر تمکین تاج کی بیٹی نگس کے ساتھ گیسٹ روم میں چلی گئی۔ جب شاہ پال میس جانے کے لیے روانہ ہوا۔ تو جھرنا بھابھی کی انگلی تھامتے ہوئے چار سالہ امجد نے کہا۔

"بچا جان! آپ بھی یہیں رک جائیں نا۔" شاہ پال کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"سر۔" اس نے پلٹ کر امجد کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ کس دنیا کے باشندے ہیں۔"

"ہماری دنیا ایک ہے۔" میجر تمکین تاج نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "شاہ پال کیانی فکر نہ کرو۔ زندہ قوموں کی زندگی میں ایسی آزمائش آتی ہی رہتی ہے۔ ہمیں بے پناہ صبر' ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔"

[illegible] کی طرف بڑھا [illegible] طرف سے ایک سایہ آگے آیا۔ یہ میجر فیروز خان تھے۔

"آپ اس وقت کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

شاہ پال نے اک ذرا خوف کے احساس سے ان کی طرف دیکھا۔

دراز قد فیروز خان انگلیوں میں سگریٹ دبائے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کا کیپٹن شاہ پال سے کوئی بگاڑ نہیں تھا۔ لیکن ان کے لہجے میں ایک باپ کی سرزنش اور بڑے بھائی کا سا تحکمانہ انداز نمایاں تھا۔ شاہ پال کوئی جواب نہ دے سکا اور اس کے منہ سے نکلا۔

"سر! آپ جاگ رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔ "جاگ رہا ہوں۔ تو جب ہی تمہارے سامنے موجود ہوں۔ تم سے سوال کر رہا ہوں۔ ہاں میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔"

اب شاہ پال کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہ تھا کہ وہ بیتی ہوئی داستان کہہ سنائے۔ میجر فیروز خان نے اطمینان سے ساری بات سننے کے بعد کہا۔

"بات یہ ہے شاہ پال کیانی کہ اب ہم ان کو مفتوحہ گھر نہیں سمجھتے ہی وہ اصل وجہ ہیں' یہ لوگ ہمیں لٹیرا' دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ اب ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔ بے حد محتاط۔ اگر خدانخواستہ بات مذاکرات سے نہ سنبھل سکی۔ تو پھر ہم اس محاذ پر ہوں گے۔ جہاں آگے دشمن ہو گا اور پیچھے وہ دوست' جو اب دشمنی کی سطح پر آ چکے ہیں۔ ایسے میں ہمیں ذاتی سطح پر حالات درست رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس وقت کوئی بھی جذباتی صورت حال کسی بھی حادثے یا پھر سانحے کا باعث بن سکتی ہے۔ ہمیں اپنے سامنے پیش آنے والا محاذ صاف دکھائی دے رہا ہے۔" وہ دونوں برآمدے میں ایک طرف پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ڈھاکہ کے آسمان پر چاند ایک باریک بیضوی لکیر کی صورت میں نمایاں تھا۔ اکا دکا بادل ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ قریبی لو کنٹونمنٹ میں زندگی سو رہی تھی۔ اچانک میجر مصطفےٰ کمال کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آ گیا۔

"کیا بات ہے؟" میجر فیروز خان نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟"

"خیریت تو ہے۔ لیکن نیند نہیں آ رہی۔" مصطفےٰ کمال [illegible] پھر وہ میجر فیروز خان کے قریب آ گیا۔

"[illegible] ہوا ہے؟"

"ایک بیچ کریں مت۔" انہوں نے کہا۔

"اب اس وقت کا بھی کیا کہنا۔ عجب مسافرت کا رنگ اختیار کر گیا ہے۔ کہیں صبحیں نہیں ہوتیں' کہیں شامیں نہیں ہوتیں۔"

"تم اتنی دیر سے کہاں تھے کاکے۔" مصطفےٰ کمال نے شاہ پال سے پوچھا۔ "ڈنر پر بھی غیر حاضر تھے۔ بغیر بتائے کہیں مت جایا کرو۔ کیا تمہیں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا اندازہ نہیں۔"

شاہ پال کوئی جواب نہ دے سکا۔ برادر افسر کے طور پر مصطفےٰ کمال کی سرزنش بجا تھی۔ میجر فیروز خان نے بیتی ہوئی داستان کا خلاصہ کہہ سنایا۔ تو مصطفےٰ کمال نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ قمرالدین قاضی صاحب ایک نیک' محب وطن اور شریف النفس انسان ہیں۔ تمہارا وہاں اس طرح تنہا جانا بالکل مناسب نہیں۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ یہ ایک الگ بات ہے۔ انہوں نے حسن امام اور منو بھابھی کے اعزاز میں ہمیں

بھی دعوت پر مدعو کر کے ہماری عزت افزائی کی ہے اور جب وہ تمہیں اپنی فرزندی میں قبول کرنے کا عندیہ دے چکے ہیں تو پھر احتیاط اور بھی لازمی ہے تاکہ سکون کا عمل سامنے آنے دو۔ ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں تمہیں مایوس تو نہیں کرنا چاہتا۔" میجر فیروز خان نے کہا۔ "لیکن مجھے اس کی کوئی امید نہیں۔"

"آج ہی جیسور سے ایم آئی (ملٹری انٹیلی جینس) کے کرنل حق نواز نے رپورٹ دی ہے کہ یہاں ڈھاکہ میں سیکنڈ کیپٹل (دوسرا دارالخلافہ) بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ناور محی الدین بریگیڈیئر سراج کی معاونت سے قومی ایرلائن۔ پی آئی اے (پاکستان انٹرنیشنل ایرلائن) کو توڑ کر اپنی علیحدہ ایرلائن تشکیل دینے کا بھی حتمی فیصلہ کر چکے ہیں۔ کرنل حق نواز کل یہاں پہنچ رہے ہیں اور پرسوں ہیڈ کوارٹر میں کانفرنس ہے۔ جس میں بریگیڈیئر خلیل الرحمن شعلہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کریں گے۔"

"تم ہماری باتوں کو محسوس نہ کرنا شاہ بال۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔ "آئندہ [illegible] [illegible] میں خود کو [illegible] کہہ رہا ہوں۔"

"مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے۔ مجھ میں بشری کمزوریاں تو ضرور ہو سکتی ہیں۔ لیکن میرے پیش نظر میرے وطن کا وقار ہے سر۔" وہ پرجوش لہجے میں بولتا چلا گیا۔ "ہم رہیں نہ رہیں۔ لیکن وطن سلامت رہنا چاہیے۔"

"ویری گڈ۔ بہت اچھا۔" میجر فیروز خان نے تالی بجا کر شاہ بال کے اس جذبے کی داد دی۔ "ہمیں وہ عہد نبھانا ہے۔ جو ہم نے یہ وردی پہن کر قرآن پاک پر حلف اٹھاتے ہوئے کیا تھا۔ اور ان شاء اللہ ہم سب سرخرو ہوں گے۔"

"ان شاء اللہ۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔

"ہم اپنے مفادات سے بلند ہو کر اپنے وطن کا دفاع کریں گے۔"

"چلیے۔" میجر فیروز خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کچھ دیر سونے کی کوشش کرتے ہیں۔ صبح آفس کی تو چھٹی ہے۔ اتوار کا دن شاید پر سکون گزر جائے۔ ویسے کچھ پتا بھی نہیں کہ کب بلاوا آ جائے۔"

"ارے ہاں مجھے یاد آیا۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔ "کل شام ہمیں منیرہ بھابھی اور حسن امام نے اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہے۔"

"کس لیے تکلیف کر رہی ہیں بھابھی صاحب۔" میجر فیروز خان نے کہا۔ "تم منع کر دیتے انہیں۔"

"چلیں اسی بہانے ہم لوگ مل بیٹھ لیں گے۔ اپنا دکھ سکھ بانٹ لیں گے۔"

"ہاں بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" فیروز خان نے تائید کی۔

"کاکے تیرے لیے بھی یہ دعوت خاص ہے۔" مصطفےٰ کمال نے شاہ بال سے کہا۔

"[illegible]" میجر [illegible] ضروری [illegible]

"بے حد ضروری۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔ "وہاں کچھ مہمان ایسے بھی ہوں گے۔ جنہیں دیکھ کر تیرے دل کی مرجھائی ہوئی کلیاں کھل اٹھیں گی بلکہ رقص کرنے لگیں گی۔"

"چلیے چلنا برخوردار۔" میجر فیروز نے کہا۔ "میں نے کافی عرصے سے کلیوں کا رقص نہیں دیکھا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" میجر فیروز خان نے کہا۔ "کل شام ہم بھی دیکھ لیں گے۔"

باقی آئندہ شمارے میں

قارئین ......!

ہمارا اندازہ تھا کہ پاکستان کی تاریخ کے المناک ترین دور کی یہ داستان اس ماہ مکمل ہو جائے گی لیکن ان خوں چکاں اور دل دوز حقائق کا احاطہ اس قسط میں ممکن نہیں ہو سکا۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ آخری قسط شائع ہو گی۔ ناول کے آغاز پر آخری قسط لکھا گیا ہے۔ اس سہو کے لیے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

ساجدہ حبیب

وردی، وعدہ اور وفا

70ء کی دہائی کے مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی اس کہانی کے کردار وطن کی محبت اور رشتوں کی ڈور میں بندھے نظر آتے ہیں۔ میجر حسن امام تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ان کے والد مرتضیٰ امام نے سرکاری افسری میں بھی نیک نامی ہی کمائی۔ مشرقی پاکستان پوسٹنگ کے دوران ان کی نظر منزہ میر علی پر ٹھہرتی ہے اور وہ پہلی نظر میں ہی اس کی باوقار اور سلجھی شخصیت کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔

منزہ میر علی، رفیق صدیقی کی سربراہی میں وفد کے ساتھ دورے پر مشرقی پاکستان آئی ہے اور کرنل سلطان گیلانی کی بھانجی ہے۔

پوٹھوہار سے تعلق رکھنے والے کیپٹن شاہ یال کو مشرقی پاکستان آتے ہوئے علم نہ تھا کہ یہاں پروفیسر قمرالدین قاضی کی صاحبزادی ڈاکٹر سنبل عرف بیاء کی کالی آنکھیں اپنا اسیر کر لیں گی۔ کیپٹن شاہ یال اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شاہ یال کی تربیت بے جی نے مضبوط پیمانے پر کی ہے۔ بچپن میں ماں باپ سے محرومی نے اسے بے حد حساس اور ذمہ دار بنا دیا ہے۔ تایا محمد خان نے اس کے سر پر سایۂ شفقت رکھا۔ وہ اپنی آباء کی پیروی کرتے ہوئے فوج میں کمیشن لیتا ہے۔

بڑی بہن کو کم عمری میں طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ اور ننھی کومل ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ شاہ یال بنگال ٹرانسفر سے گھر بھر میں تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ لیکن تایا محمد خان اور شاہ یال سب کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر بیاء کے انتخاب پر بے جی اور بے جی بے حد مسرور ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر بیاء کی چھوٹی بہن کومل کیپٹن شاہ یال اور ڈاکٹر بیاء کے درمیان پل کا کام کرتی ہے جبکہ اکلوتے بھائی ممتاز قاضی عرف مستی کو گھر میں اس کی آمد و رفت قطعاً پسند نہیں ہے۔ شاہ یال اپنی طرف سے بات کرنے کے لیے اپنے سینئر افسر میجر سکین تاج اور ثمرہ بھابھی سے درخواست کرتا ہے وہ اسے اپنے مکمل تعاون کا یقین

مکمل ناول



دلاتے ہیں۔

نادر محی الدین بدطینت گھاگ سیاست دان ہے جو وطن دشمن عناصر کے ساتھ مل کر ملک توڑنے کے منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ بریگیڈیئر سراج کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ نادر محی الدین کی بہن نزہت باری ان ہی کی طرح متعصب ذہنیت رکھتی ہیں۔ انہیں اپنے لاڈلے اور ضدی بیٹے نوید باری کے لیے کرنل سلطان کی بیٹی ثناء پسند آجاتی ہے۔ کرنل کیانی کو بیگم نزہت کی ہٹ دھرمی ناگوار گزرتی ہے۔ تاہم نادر محی الدین اور بریگیڈیئر سراج کے داؤ میں کرنل سلطان کا گھرانہ اپنی سادہ لوحی کے باعث آجاتا ہے۔

بریگیڈیئر سراج کے شرانگیز بیان پر مغربی پاکستان سے آیا وفد بائیکاٹ کرتے ہوئے دورہ مختصر کردیتا ہے۔ سینیٹر رکن رفیق صدیقی کی شکایت پر بریگیڈیئر سراج کی جی ایچ کیو میں طلبی ہوجاتی ہے۔ کھسیاہٹ میں وہ مغربی پاکستان سے آئے میجر حسن امام اور میجر مصطفیٰ کمال پر غصہ نکالتے ہیں۔ میجر حسن امام اور میجر مصطفیٰ کی بھی جی ایچ کیو حاضری ہوتی ہے۔

کرنل سلطان کیانی کی بیٹی کی شادی میں میجر حسن امام کی منزہ میر علی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ اس کے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ سوئے اتفاق وہ بھی اس فلائٹ سے واپس مغربی پاکستان جارہی ہے، جس سے میجر حسن اور میجر مصطفیٰ کی واپسی ہے۔ میجر مصطفیٰ کمال محبت کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے میجر حسن امام کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۴

چوتھی اور آخری قسط

صبح کا اجالا نمودار ہوا اور بنگال کی سنہری دھوپ ہر طرف پھیل گئی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ جب میس والے نے کیپٹن شاہ پال کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر ٹیلیفون کال کی اطلاع دی۔ ریسپشن کے کاؤنٹر پر رکھے گئے ٹیلی فون تک پہنچتے پہنچتے کئی ایک خوف کے سائے سامنے آتے چلے گئے۔

”ہیلو۔“ کہتے ہی دوسری طرف سے مستی کی آواز آئی۔

”مبارک ہو کیپٹن شاہ پال۔ تمہاری خواہش کے عین مطابق میرے والد گرامی نے مجھے جائیداد سے عاق کردیا ہے۔ کومل نے انہیں فون پر سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب میرے لیے حکم ہے کہ میں ان کی واپسی سے پہلے آج شام تک گھر چھوڑ دوں۔ میں ایسا ہی کررہا ہوں اور تمہیں مطلع کررہا ہوں کہ اب کھلی جنگ ہوگی۔“ اور فون بند ہوگیا۔

سارا دن بے چینی میں گزر گیا۔ وہ کسی سے کچھ نہ کہہ سکا۔ کسی کو نہ بتا سکا کہ اب اس کا سفر کرب کی کن منزلوں کی طرف رواں دواں تھا۔ اب اس راہ سے پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہیں تھا۔ رات دن کو میجر حسن امام اور منزہ بھابھی کے ہاں پہنچا۔ تو قاضی صاحب بمعہ فیملی چٹاگانگ سے سیدھے دعوت میں شرکت کے لیے پہنچ چکے تھے۔

کومل لپک کر ملنے چلی آئی۔ جبکہ ڈاکٹر ریا کی آنکھوں میں [illegible] شکوے تھے۔ ویسے بھی وہ بہت [illegible] گئی۔ [illegible] ہوئے۔ قمرالدین قاضی صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”کل شام جو کچھ بھی ہوا۔ مجھے دلی طور پر اس کا بے حد افسوس ہے۔ کومل کے لیے تم نے جو کیا۔ اس کے لیے میں دلی طور پر تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”سر۔“ کیپٹن شاہ پال نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے مستی کے بارے میں فیصلہ کرنے میں جلدی کی۔“

”کوئی جلدی نہیں کی۔“ وہ پر اعتماد لہجے میں گویا ہوئے۔ ”میں بہت عرصے سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے اس فیصلے میں اس کی والدہ برابر کی شریک ہیں۔ مستی میرا اپنا خون ہے تو کیا ہوا۔ میرے ضمیر کی دنیا میں غداروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔“

میجر نگین تاج نے واقف حال ہونے کی بنا پر وکالت کرنا چاہی لیکن قمرالدین قاضی صاحب نے صاف کہہ دیا۔

”بہتر ہے کہ ہم آئندہ اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں۔“ ریا کی نظروں کا بھی پیام تھا کہ اب اس بارے میں کوئی بات نہ کی جائے۔

گردن کے ہلکے سے اشارے کے ساتھ شاہ پال نے سر تسلیم خم کیا اور آنکھوں نے کہا۔ ”شکریہ۔“

احباب کا رخ اب ڈائننگ ہال کی طرف تھا۔ جہاں منزہ بھابھی کا سلیقہ واضح نظر آرہا تھا۔

”ہماری بیگم صاحبہ نے کسی اندرونی اور بیرونی امداد کے بغیر یہ تمام ڈشیز خود تیار کی ہیں۔“ حسن امام نے بتایا۔

”واہ کیا بات ہے بھابھی صاحبہ۔“ مصطفیٰ کمال نے کہا۔ ”اسی لیے تو اس فوجی نے آپ کے سامنے ہتھیار ڈال لیے ہیں۔“

”کمال ہے بھئی۔“ جھرنا بھابھی نے کہا۔ ”تاریخ کی طالبہ۔ سرکاری ملازم اور اس قدر سلیقہ۔ یقین نہیں آتا۔“

”لیکن مجھے ایک بات کا بے حد افسوس ہے۔“ میجر نگین تاج کی بات پر سب ہی چونک گئے۔ ”ہم محترمہ بھابھی صاحبہ کو نئی زندگی کی شروعات پر ماسوائے ملکی شورش اور پریشانی کے اور کوئی تحفہ نہ دے سکے۔“

”کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔“ منزہ نے کہا۔ ”اب میں اپنی ذاتی زندگی سے بالاتر [illegible] تو ہم بھی [illegible] وطن [illegible] اس سرزمین کے بغیر کچھ بھی نہیں۔“

”اللہ پاک اس سرزمین پر اپنا رحم و کرم فرمائے۔“ جھرنا نے کہا۔

”آمین۔“ سب کے دل سے بیک وقت آواز نکلی۔

سنجیدگی اور شوخی کے ملے جلے ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ مصطفیٰ کمال ازراہ شرارت منزہ سے پوچھ رہے تھے۔

”ایک بات تو بتائیں۔ وہ جو آپ نے پہلی ملاقات میں ہمارے برخوردار میجر حسن امام کے سامنے مندرجہ ذیل بیانات دیے تھے کہ میں اپنا بوجھ اٹھانا خود جانتی ہوں اور میں اپنا راستہ بنانا خود جانتی ہوں۔ ان غریب بیانات کا کیا بنا؟“

”وہ اس وقت کی مناسبت سے شاید ایک تکلف تھا لیکن اب۔۔۔“ وہ خاموش ہوگئی۔

”اب کیا؟“ جھرنا نے بے تابی سے پوچھا۔

”زندگی ان کے بنا کچھ بھی نہیں۔“ منزہ نے جواب دیا۔

”اوہ مائی گاڈ۔“ میجر فیروز خان نے اونچی آواز میں کہا۔ ”محترمہ بھابھی صاحبہ۔ آپ نے اتنی جلدی بیان بدل لیا۔ یہ تو سیاست دانوں والی صفت ہے۔“ منزہ خاموش رہی تو فیروز خان نے کہا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں۔ آپ کو میری بات بری تو نہیں لگی۔“

”یہ کوئی مائنڈ کرنے والی بات نہیں۔“ منزہ نے ہنس کر کہا۔

”شکریہ۔“ فیروز خان نے کہا۔ ”ورنہ میرے نوٹ ہونے میں تو قطعی کوئی کسر باقی نہ بچی تھی۔“

دعوت اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک جھرنا نے انکشاف کیا۔ شاہ زمانی بیگم باقاعدہ طور پر کیپٹن شاہ پال اور ڈاکٹر ریا کی منگنی کی رسم ادا کرنا چاہتی تھیں۔ شرکائے محفل کو اگرچہ اس امر پر قطعی کوئی اختلاف نہ تھا۔ لیکن حالات موافقت میں نہ تھے۔ یہ بات جب سامنے آئی تو باقاعدہ مشاورت کے بعد طے پایا کہ کیوں نہ ابھی اسی وقت یہ رسم باقاعدہ طور پر ادا کردی جائے اور سب نے اس پر اتفاق کیا تو بقول شخصے کیپٹن شاہ پال اور ڈاکٹر ریا کے دل کی مراد بر آئی۔ زندگی بھر کے خوابوں کو ان کی تعبیر عملی صورت میں نصیب ہوگئی۔

اور وہ۔۔۔ جو تہی دست اور تہی داماں اس گھر کے اندر آیا تھا بانصیب بن گیا۔ بھائیوں کی طرح مہربان حسن امام نے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر مبارک باد پیش کی اور بڑی بھابھی کی طرح منزہ حسن امام نے اپنی شادی کے جوڑے کا سرخ دوپٹہ ڈاکٹر ریا کے سر پر ڈال کر انگوٹھی کیپٹن شاہ پال کو پیش کی تاکہ وہ اسے ریا کو پہنا کر اس رشتے پر اپنی وفا کی مہر ثبت کرسکے۔ محفل کا رنگ یک دم بدل گیا۔

آسمان سے خوشیاں دھرتی پر اتر آئیں۔ مسکراہٹوں نے ہر طرف جگمگاہٹ کا سماں بکھیر دیا۔

خوشیوں کے اسی رنگ میں بغیر اطلاع کے ثناء اور نوید باری بھی چلے آئے۔ ثناء کی شکایتی نگاہوں نے منزہ کو بتلا دیا کہ اسے شریک دعوت نہ کرنے پر زبردست شکوہ تھا۔

”میں بلانا تو چاہتی تھی۔“ منزہ نے اعتراف کیا۔ ”لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تمہاری ساس صاحبہ سے بہت ڈر لگتا ہے اور پھر۔۔۔ ان دنوں تمہاری طبیعت بھی تو کچھ

"ٹھیک نہیں ہے نا؟" منزہ مسکرانے لگی۔

ثنا نے جوابی مسکراہٹ سے اس کی بات کی تصدیق کی۔ لیکن اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "پتہ نہیں نوید کیا سوچیں گے؟"

"اس کی سوچ پر تو اماں جانی نے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔" جھرنا نے شریک گفتگو ہوتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو اور سناؤ کیا حال چال ہے؟"

"نوید کل شام کی فلائیٹ سے جرمنی روانہ ہو رہے ہیں۔"

"کیوں کس سلسلے میں؟" منزہ نے پوچھا۔

"وہاں پی ایچ ڈی کرنے جا رہے ہیں۔" ثنا نے بتایا۔

"چلو یہ تو سونے پر سہاگہ والی بات ہوئی۔" جھرنا نے تبصرہ کیا۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ پی ایچ ڈی کا مطلب ہے "پھرا ہوا دماغ" ان کی اماں جانی نے تو پہلے ہی ان کا دماغ درست کر رکھا ہے۔ رہی سہی کسر پی ایچ ڈی کی ڈگری پوری کر دے گی۔ سوری ثنا! مجھے تو تمہارا مستقبل بہت مشکوک نظر آ رہا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں بھابھی۔" ثنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔"

"یہی تو شرقیت کی نشانی ہے۔" جھرنا نے کہا۔

شاہ زمانی بیگم خواتین کے درمیان ہونے والی اس گفتگو سے محظوظ ہوتی رہیں۔ رات کا رنگ روشن تھا۔

"اجازت ہے بھابھی؟" جھرنا نے منزہ سے اجازت لینی چاہی۔

"بیٹھیں نا بھابھی۔" منزہ نے کہا۔ "اتنی جلدی کیا کریں گی گھر جا کر۔ ہیم ہاؤس ہیم پکن۔"

"اینڈ ہیم اولڈ مین۔"

میجر مصطفےٰ کمال نے لقمہ دیا۔ تو محفل کشت زعفران بن گئی۔

"بچوں کو صبح اسکول جانا ہے۔" جھرنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور ساس کے بچے نے دفتر جانا ہے۔" مصطفےٰ کمال نے برجستہ کہا۔

ایسی ہی نوک جھونک میں شب کا چاند مسکراتے ہوئے اپنا سفر طے کرتا رہا اور مہمان رخصت ہو گئے۔ شاہ ولی کے آنسوؤں نے وقت رخصت شکریہ ادا کیا کہ زبان تو بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر لفظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ کم گو ڈاکٹر ہیا نے تشکر آمیز نگاہوں سے شکریہ کیا۔ اور کومل نے اپنی روایتی شوخی کے ساتھ منزہ کے گلے لگ کر شکریہ ادا کیا۔

"بہت شکریہ بیگم صاحبہ!" حسن امام کہہ رہے تھے۔ "آپ نے تو کمال کر دیا۔ اتنی زبردست دعوت اور اتنا زبردست سرپرائز۔ میرا خیال ہے کہ آپ خواتین نے ہم سب سے بالا ہی بالا اس سارے پروگرام کی منصوبہ بندی کی ہوئی تھی۔"

"آپ یقین کریں کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" منزہ نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "جب قدرت نے اپنا کوئی بہترین فیصلہ کسی کے بہترین مفاد کے لیے کرنا ہوتا ہے۔ تو وہ اس کے لیے اسباب بھی ترتیب دیتی ہے۔"

"جس طرح ہمارے اور آپ کے کیس میں ہوا۔" حسن امام مسکرائے۔

"بالکل۔" وہ وثوق سے بولی۔

"تو گویا آپ نے قدرت کا احسان اتار دیا۔" حسن امام نے کہا۔

"میں تو اگر دس مرتبہ بھی جنم لوں۔ تب بھی قدرت کے اس احسان عظیم کا بدلہ نہیں اتار سکتی۔ رب کریم نے مجھے بہت بہترین زندگی عنایت فرمائی۔ میں اس وطن کے لیے وفادار ہوں اور آپ سب کی سلامتی کے لیے بھی۔"

"بے شک۔" حسن امام نے کہا۔ "فوج سے وابستہ زندگی بلاشبہ انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق زندگی بھر مسلمان کا ایمان قائم رکھتا ہے۔"

"بہرحال...... ہمیں تو اس وقت آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔" انہوں نے تعریف کی۔

"کیسا کمال صاحب!" منزہ نے کہا۔ "یہ سب تو آپ کی ذات گرامی کا کمال ہے کہ اب زندگی تو آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں۔"

"شکریہ۔" حسن امام کو اپنی خوش قسمتی پر بے حد رشک آیا۔

ان شورش زدہ حالات میں بھی فوجی ٹولہ کنٹونمنٹ کے اندر زندگی اک ذرا تناسب کے ساتھ رواں دواں تھی۔ اخبارات میں "جئے بنگال" سے متعلقہ خبروں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ بریگیڈیئر سراج بیانگ دہل نادر محی الدین کی اس پارٹی میں شمولیت اختیار کر چکے تھے اور اس پارٹی کا نعرہ "بنگال ہمارا ہے" اب زبان زد عام تھا۔

پارٹی کے کارکن انتہائی نڈر اور بے باک تھے اور گرفتاری پیش کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ پارٹی میں بریگیڈیئر سراج کی شمولیت کے باعث اس کی سرگرمیاں تیز ہو چکی تھیں اور کئی اہم راز نادر محی الدین کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ ان حالات میں میجر سکین تاج کی پریشانی دیدنی تھی۔ انہوں نے ذاتی طور پر بریگیڈیئر خلیل الرحمٰن شعلہ سے ملاقات کے لیے درخواست کی۔ وہ تنہائی میں ملنا چاہتے تھے۔

ملاقات کا وقت طے ہوا اور وہ ایک محب وطن سپاہی کی زبان میں بول رہے تھے۔

"یہ شخص ہمارے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو رہا ہے سر!" وہ مؤدب لہجے میں گویا ہوئے۔ "اب سوچنے کا وقت نہیں۔ اگر ہم خاموش رہے تو فوج سے متعلق تمام اہم راز ان اپنوں کے پاس سے ہوتے ہوئے دشمنوں کے پاس منتقل ہو جائیں گے۔ ہمیں فوری طور پر فیصلہ کرنا ہوگا سر! ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہماری بدنصیبی یہ ہے سکین تاج! کہ ہم جسے شورش اور دہشت گردی قرار دے رہے ہیں۔ وہ لوگ جہاد کا نام دے رہے ہیں۔ نادان ہیں۔ شاید نہیں جانتے کہ جہاد غیروں کے خلاف کیا جاتا ہے۔ اپنوں کے خلاف نہیں۔ ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے اس کا فیصلہ ہائی کمان کی مشاورت سے کیا جائے گا۔"

"نہیں سر! ہرگز نہیں۔" میجر سکین تاج کے جواب نے بریگیڈیئر خلیل کو چونکا دیا۔ انہوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

ان سے کئی درجے جونیئر میجر رینک کا یہ بنگالی فوجی افسر ان کے دلائل قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ وہ حیران تھے کہ ان کی دنیا میں انکار کی تو قطعی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

آج یہ وطن پرست اپنے اندر بسنے والی حب الوطنی کی انتہا پر جا کر کسی بھی قسم کے حکم کی پابندی سے بالاتر اپنا فیصلہ خود کرنا چاہتا تھا۔

"یہ انقلاب نہیں سر! ان اغیار کی چال ہے، جنہوں نے کبھی ہمیں ہمارے وطن کو ہمارے تشخص کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ اس مشاورت کی رسّی بہت دراز ہو جائے گی سر! ہمیں اپنے طور پر کچھ کرنا ہوگا۔"

"میں تمہارے اس گراں قدر جذبے کی قدر کرتا

ہوں۔" بریگیڈیئر خلیل نے کہا۔ "لیکن یاد رکھو سکین تاج! ہم فوجی ہونے کے ناتے ڈسپلن اور آئین و ضوابط کے پابند ہیں۔ اپنے طور پر فیصلہ کرنے کا ہمیں اختیار نہیں۔ پھر یہ تو ہماری آپس کی جنگ پہلے ہے۔ دشمن کا سامنا دوسرے نمبر پر ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے سر!" سکین تاج نے کہا۔

"بہت ممکن ہے کہ اب میں اس سے زیادہ سوچ نہ سکوں سر! کہ اب ہم حالت جنگ میں ہیں۔"

"ہم فوجی ڈسپلن کے ناتے احکامات کے پابند ہیں اور ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے۔"

"ہم نے تو کبھی کچھ فراموش نہیں کیا سر!" سکین تاج نے کہا۔

"لیکن جہاں بریگیڈیئر سراج جیسے وطن کے محافظ وطن فروش بن کر سب کچھ فراموش کردیں پروفیسر روشن خیال جیسے اخلاقیات کا درس دینے والے بے ضمیر بن کر غداری کا سبق دینا شروع کردیں۔ نادر محی الدین جیسے سیاست دان یک جہتی کا نعرہ لگانے کے بجائے علیحدگی کے نظریات کا پرچار کریں۔ وہاں ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے۔"

"تمہارا جذبہ قابل قدر ہے سکین تاج!" بریگیڈیئر خلیل نے کہا۔

"لیکن تاریخ کے اس انتہائی نازک اور اہم موڑ پر ہمیں ہر قدم نہایت عقل مندی سے سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔"

"بہت بہتر سر!" میجر سکین تاج نے فوج کے روایتی ڈسپلن کے تحت کہا۔ "مجھے اجازت ہے سر!"

"ضرور تم جاسکتے ہو۔" بریگیڈیئر خلیل نے جواب دیا۔

میجر سکین تاج اجازت پاکر باہر آگئے۔ تو بنگال کے بھرے بادل رم جھم کی پھوار برسا رہے تھے۔ تیز چلتی ہوئی ہوا اور برستی ہوئی بوندوں میں بنگال کی دھرتی بے حد خوب صورت نظر آرہی تھی۔ سبزے اور ہریالی نے ایک حسین سماں بکھیر دیا تھا۔

"کتنی خوب صورت ہے میرے وطن کی دھرتی۔" انہوں نے سوچا اور اس میں آگ لگانے والے شرپسندوں کو اس کا احساس ہی نہیں" وہ آگ لگا کر اس دھرتی کو اس کے آدرشوں سمیت بھسم کرنا چاہتے ہیں۔ خدایا! کون لوگ ہیں یہ؟ کدھر سے آئے ہیں؟ اور کس سمت کو مڑ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

کیا یہ وطن" یہ میرا چمن بڑی آسانی سے دشمن کی سازش کامیاب ہونے کے بعد اجڑ جائے گا۔ میجر سکین تاج اپنے دوسرے محب الوطن ساتھیوں کے ہمراہ کیا صرف دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔" ان کے دل سے آواز آئی۔ "میجر سکین تاج کی زندگی میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔"

فیصلہ ہوچکا تھا۔ لیکن یہ صرف ان کی اپنی ذات تک محدود تھا۔ اس پر عمل درآمد کس طرح ہوگا۔ یہ بات تو آنے والے وقت پر منحصر تھی اور وہ وقت بہت جلدی آگیا تھا۔



مدھم برستی بارش والی اس شام مین شاہرہ کی دوسری سمت واقع "باری ہاؤس" کی طرف جانے والی سڑک پر شاہ پال نے دیکھا۔ بریگیڈیئر سراج کی گاڑی "باری ہاؤس" کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ رک گیا۔ اور غور سے حالات کا جائزہ لینے لگا۔

"باری ہاؤس" کے اندر سے نادر محی الدین ان کے استقبال کے لیے باہر نکلے اور پھر دونوں اندر کی سمت چلے گئے۔ ڈرائیور نے پچھلی سیٹ سے کاغذات کا ایک پلندہ اٹھایا۔ اور دروازے پر کھڑے ملازم کو پکڑا کر واپس گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دو گاڑیاں مسز ... باری کی طرف آئیں۔ ان کے ہمراہ اچھی شکل و صورت کی چند خواتین تھیں۔ کیپٹن شاہ پال نے دوسری طرف واقع درختوں کی آڑ سے دیکھا کہ آنے والی تیسری گاڑی میں سے جوشی اور مستی سمیت چند نوجوان اتر کر "باری ہاؤس" کے اندر چلے گئے۔

تو گویا "باری ہاؤس" واقعی سازشوں کا گڑھ بن چکا تھا۔ انٹیلی جنس کی اطلاعات تو صحیح تھیں۔ لیکن محض مصلحت کی خاطر کسی بھی قسم کا کوئی بھی ایکشن کرنے کا فیصلہ مؤخر کردیا گیا تھا۔ مذاکرات کی مزید راہیں ہموار کرنے کا سوچا جا رہا تھا۔ لیکن یہاں بات مذاکرات سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔

کیپٹن شاہ پال کو ایک دم "باری ہاؤس" کے اندر مقیم ثنا کا خیال آگیا۔ کرنل سلطان کیانی کی بیٹی ان حالات میں کتنی تنہا تھی۔ اور اپنے ان ہم وطن اجنبیوں کے درمیان غیر محفوظ بھی۔ وہ عجیب خوف زدہ سوچوں کے حصار میں گھر گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک گاڑی تیزی سے آئی اور پروفیسر روشن خیال کو گیٹ پر اتار کر چلی گئی۔ کیپٹن شاہ پال

کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا کہ آج واقعی کوئی اہم اجلاس ہو رہا تھا۔ جس میں شاید ضروری فیصلے کیے جانے تھے اور یہ صورت حال نہایت پریشان کن ثابت ہوسکتی تھی۔

وہ اس شام ایک سرکاری کام کے سلسلے میں ہیڈ کوارٹر سے واپس آیا تھا۔ میس پہنچ کر اس نے میجر فیروز خان اور مصطفیٰ کمال کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ فوراً ساری بات بریگیڈیئر خلیل الرحمان شعلہ کے نوٹس میں لائی گئی۔ وہ الرٹ تھے کہ انہیں اس ضمن میں رپورٹ مل چکی تھی کہ عنقریب "جسے بنگال" کے اراکین پارٹی کوئی ہنگامہ برپا کرنے والے ہیں۔ لیکن وہ کمال تحمل اور ضبط کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

"اگر یہ واقعی ان کا کوئی اہم اجلاس ہے۔ تو اس کا ردعمل دیکھے بغیر ہم کوئی ایکشن نہیں لے سکتے۔ پہلے ان کا عمل سامنے آنے دیجیے۔ پھر ہم اپنے ردعمل کے لیے مناسب پلاننگ کریں گے۔"

"سر!" میجر فیروز خان نے مودب لہجے میں کہا۔ "قومی سطح پر ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہر اہم موقع پر ہمیں ہماری مجبوریاں مار جاتی ہیں۔"

"آپ ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے کی مت سوچیں یہ بھی یاد رکھیے کہ قومی زندگی میں فوج ہی وہ واحد ادارہ ہے جہاں حکم عدولی کرنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔" بریگیڈیئر خلیل الرحمان نے کہا۔ "ہمیں بہت جلدی پتا چل جائے گا کہ یہ سب لوگ کن فیصلوں پر متفق ہیں۔ پھر ہم اپنا آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دے لیں گے۔"

ان کی بات ختم ہوچکی تھی۔ ڈھاکہ کا آسمان بھی بارش برسا کر اب خاموش تھا اور گہری رات کی آمد تھی۔ میس کے کمرے میں میجر فیروز خان کہہ رہے تھے۔

"خدا جانے کیا بات ہے کہ ہر مرتبہ ہم زمین پر جیتی ہوئی جنگ مذاکرات کی میز پر ہار جاتے ہیں اور اب کی بار اس قوم کی بدنصیبی دیکھو کہ سب کچھ سامنے نظر آنے پر بھی "دیکھو اور غور کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔" ہمیں انتظار کرنا ہوگا فیروز خان! جب تک ہمارے لیے احکامات جاری نہیں ہوتے۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ یہ انتظار طویل نہیں ہونا چاہیے۔"

اور پھر واقعی میجر فیروز خان اس طویل انتظار سے بچ گئے۔ انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق "جسے بنگال" کے سرکردہ رہنماؤں سے لے کر عام کارکن تک کے ارادے نہایت خطرناک تھے۔

بریگیڈیئر سراج کے بے مثال تعاون سے یہ لوگ فوج کی اہم تنصیبات تک رسائی حاصل کرنے کے علاوہ "مکتی باہنی" کے نام سے ایک ذاتی فورس تشکیل دے چکے تھے۔ جو فی الحال ایک باقاعدہ تنظیم نہ تھی۔ لیکن جتھوں اور ٹولیوں کی صورت میں منظم ضرور تھی۔ اس کا دائرہ کار سارے ملک میں پھیلانے کے لیے جدوجہد جاری تھی۔ مقصد یہ تھا کہ کسی بھی ایکشن کی صورت میں فوج کو محاذ پر دشمن سے لڑنے کی کوشش کے دوران پیٹھ پیچھے وار کر کے کمزور کیا جاسکے۔ سب ہی جانتے تھے کہ اس تمام پلاننگ کے پس پشت کس شخص کا دماغ کام کر رہا ہے۔

نادر محی الدین اور بریگیڈیئر سراج اپنی ذات کے تمام قلعے فتح کرنے کے بعد اس کی فصیلوں پر اپنی فتح کے پرچم گاڑنے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے۔ اس نقشے پر سرست تباہی اور خون تھا۔ قومی زندگی کو مجروح کرنے کا واضح تاثر تھا۔ لیکن انہیں اس کی قطعی کوئی پروا نہ تھی۔ یہ کوئی جذبہ تھا؟ وحشت تھی؟ یا پھر جنون؟ یہ جاننا مشکل تھا۔

چنانچہ پہلے مرحلے پر صرف گرفتاریاں عمل میں لانے کے احکامات موصول ہوئے۔ جس کے تحت نادر محی الدین اور بریگیڈیئر سراج کو گرفتار کرلیا گیا۔ جوں ہی یہ خبر واضح ہوئی۔ جسے بنگال کے حامی کارکن چنگاری کے بجائے شعلہ بن گئے۔ اور یہ نشیمن جلنے لگا۔

اسی دوران ڈھاکہ مضافات میں کسی کے مقام پر جسے بنگال کے کارکنوں کا مسلح تصادم پہلی بڑی واردات کے طور پر سامنے آیا۔ جس میں کئی کارکن زندگی کی بازی ہار گئے۔ انہیں "شہادت" کے اعلا و ارفع مرتبے پر فائز کرتے ہوئے جسے بنگال کا "بنگال ہمارا ہے" کے بعد دوسرا نعرہ سامنے آیا اور جگہ جگہ بینر لہرانے لگے۔ جن پر تحریر تھا۔

"انقلابیوں کی موت سے انقلاب نہیں مرتا۔"

اس نعرے نے تو گویا اک حشر برپا کردیا۔

اور اس دبی چھپی شورش نے ایک کھلی جنگ کی صورت اختیار کرلی۔ صدہا اپیلوں کے باوجود بریگیڈیئر سراج اور نادر محی الدین کی رہائی عمل میں نہ آسکی۔ البتہ ان حالات میں بھی غیر بنگالی کے جذبات کو قائم رکھنے کے لیے بعض سرکردہ افراد کی مداخلت پر مستی اور جوشی سمیت

بعض نوجوان کارکنوں کو ایک معافی نامے پر دستخط کروانے کے بعد رہا کر دیا گیا۔

لیکن جلد ہی یہ امر ایک واضح غلطی کے طور پر سامنے آیا ان رہا شدہ افراد نے فقط چند دنوں کی خاموشی کے بعد جگہ جگہ انتشار برپا کر دیا اور انہوں نے بہت پہلے سے حاصل کردہ تربیت کے مطابق گوریلا وار شروع کرتے ہوئے فوج کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

حالات پر قابو پانے کے لیے پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مقامی آبادی نے ان عناصر کے لیے پناہ گاہیں مہیا کرنی شروع کر دیں۔ یہ پناہ گاہیں نہایت مؤثر ثابت ہوئیں اور ان کی وجہ سے کسی بھی قسم کی واردات کے بعد روپوش ہو جانا کوئی مسئلہ نہ رہا چنانچہ حالات کو مزید بگڑنے میں کوئی دیر نہ لگی۔

اور وطن عزیز کا یہ مشرقی خطہ اک جلتا ہوا آتش فشاں بن گیا مشرقی حصے میں لگی اس آگ کے شعلوں کی تپش جب مغربی پاکستان تک پہنچی تو حکمرانوں نے ملٹری ایکشن کا حکم صادر فرمایا اور اس طرح اس جلتے ہوئے آتش فشاں کا لاوا ہر طرف پھیل گیا۔

بنگال کی بہار اس آگ میں جل رہی تھی کہ حسن امام کے نام اماں کا خط آیا۔

"اب آ جا میرے بچے! کہ تجھے دیکھنے کو نگاہیں ترس گئیں۔" جواب لکھا گیا۔

"میں نہیں آ سکتا میری ماں کہ وطن پکار رہا ہے۔ میرا دیس جل رہا ہے۔ اپنوں نے اغیار کے ساتھ مل کر یہ سخت وار کیا ہے۔ ہماری وفاؤں کا خون کیا گیا ہے ماں۔ ہمارے تن پر سجی ہوئی وردی کو غداری کا پیراہن قرار دیا جا رہا ہے۔ دعا کرنا ماں کہ ہم سرخرو ہو سکیں۔"

نامہ بر نے خط منزل تک پہنچایا۔ تو جواب میں آفس کے فون پر کال موصول ہوئی۔

"تجھے دیکھنا چاہتی ہوں۔ تجھے پکارنا چاہتی ہوں اور تیری پکار کے جواب میں تیری آواز سننا چاہتی ہوں۔ تو کب آئے گا حسن امام کب؟"

بے شمار تسلیوں اور آمد کے وعدوں کے ساتھ کال کٹ گئی۔



اولین بہار کی اس صبح حسن امام حسب معمول آفس کے لیے روانہ ہوئے۔ باہر دن کا روشن سماں پھیل رہا تھا۔ سرسبز درختوں پر بہار کا رنگ نمایاں تھا۔ آج انہیں ایک ضروری سرکاری کام سے جانا تھا۔ رات تک واپسی متوقع تھی۔ وقت رخصت قریب تھا۔ منزہ دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔ گلابی جوڑا عجب بہار دکھا رہا تھا۔ سرخ و سفید چہرے پر جدائی کا تاثر نمایاں تھا۔ دونوں ہاتھوں میں تھامے گئے قرآن پاک کا سایہ ان کے سر پر کیے زیر لب درود شریف پڑھتی ہوئی وہ قدرے آزردگی کے ساتھ ان سے الوداع کہہ رہی تھی۔

"ان شاء اللہ شام تک یا پھر رات گئے واپسی ہو جائے گی۔" وہ وثوق سے کہہ رہے تھے۔ "آپ ہمیں اس قدر سنجیدگی کے ساتھ نہیں۔ بلکہ مسکرا کر رخصت کیجیے۔" وہ مسکرائی اور باہر اترتی ہوئی بہار کے رنگ ہر طرف پھیل گئے۔

"جلدی آ جائیے گا۔" منزہ نے ہمیشہ کی طرح کہا۔

"ان شاء اللہ' جلدی واپسی ہو گی۔" حسن امام نے جواب دیا۔

"فی امان اللہ۔" اپنے سہاگ کو اللہ کی پناہ میں سونپ دیا گیا۔

"اللہ حافظ۔" اسے اللہ کی حفاظت کے سپرد کر دیا گیا۔

دن بیت گیا۔ شام در آئی۔ انتظار کے پل پہلے طویل پھر طویل ترین اور پھر شدید ہو گئے۔ جب شام اپنا سفر طے کرتے ہوئے رات کے روپ میں ڈھل گئی۔ تو بے چینی بڑھ گئی۔ شاید بہت دور سے پرواز کرتے ہوئے گہرے بہت گہرے بادل آئے۔ اور ڈھاکہ کے آسمان پر چھا گئے۔ پھر بے مہر موسم کی بارش نے اپنا رنگ جمایا اور گرج چمک کے ساتھ رب کی رحمت ہر سمت برسنے لگی۔

دل و جان پر چھائی ہوئی بے چینی نے بے کلی تک کا سفر طے کر لیا۔ جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا۔ دل کی وحشت بڑھتی چلی گئی۔

جب بے کراں سناٹے نے ورد کا سا انداز اختیار کر لیا۔ تو اچانک گاڑی کی آواز آئی۔

جو بجری کی بچھائی گئی روش پر اپنا سفر مکمل کرتے ہوئے اندر تک آ کر ٹھہر چکی تھی۔ وہ واپس آ چکے تھے۔ وہ جو محافظ تھے محب وطن تھے اور امن' سکون' محبت کے علاوہ خیر خواہی کے علم بردار بھی اور وہ جو زندگی تھے' آرزو تھے' خوشی تھے' اور سہاگ بھی وہی تو سب کچھ تھے۔ خوشی کے

گراں احساس کے ساتھ منزہ اپنا بے ترتیب آنچل سمیٹتے ہوئے ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی دروازے تک چلی آئی۔ وہ تو ہر روز اسی انداز سے ان کا استقبال کیا کرتی تھی۔ ان پر نظر پڑتے ہی مسکرا کر سوال کرتی۔

"آپ آ گئے؟"

"جی ہاں۔" وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے۔

"آ گیا ہوں۔ جب ہی تو آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

پھر وہ اپنی کیپ اس کے سر پر رکھ دیتے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیتی کہ یہی تو مان تھا۔ لیکن آج..... آج تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ لیکن بوٹوں کی مخصوص ٹک ٹک سنائی نہ دی۔ آنکھیں منتظر رہیں۔ مگر کوئی جھلکتا ہوا وجود اس دروازے سے اندر نہ آیا۔ باہر تیز ہوا کے ساتھ بارش چھما چھم برس رہی تھی۔

وحشت اور خوف کا پہلا پل گزرا۔ پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ اس کے بعد انتظار کی تاب باقی نہ رہی۔ وہ باہر نکلی۔ بہت تیز چلتی ہوئی ہوا اس کا آنچل اڑا لے گئی وہ سر اور پاؤں سے ننگی دوڑتی ہوئی پورچ میں آن رکی۔ اور پھر اک حشر کا سا سماں سامنے چلا آیا۔

وہ..... بالکل سامنے ہی تو موجود تھا۔ سولہ گھنٹے قبل اس گھر سے رخصت ہونے والا اس کا سہاگ۔ اپنی بہنوں کا پیارا بھائی اور ماں کا لاڈلا اکلوتا بیٹا۔ میجر حسن امام۔ سامنے کھڑی جیپ کی فرنٹ سیٹ پر شدید زخمی حالت میں موجود اپنی نیم وا آنکھوں سے دروازے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

منزہ دوڑتی ہوئی جیپ کے قریب آ گئی۔ پہلے ہی سر پر لیا گیا دوپٹہ۔ تیز ہوا سے اڑ کر کسی انجانی سمت جا گرا تھا۔ بجری کی روش پر پاؤں بھی لہولہو ہو گئے۔ آج یہ واپسی کس انداز سے ہوئی تھی کہ جسم شکستہ تھا اور دم لبوں پر پرواز کے لیے تیار۔ خاکی پیراہن لہو رنگ ہو چکا تھا اور بہتے لہو کا اک اک قطرہ فریاد کناں تھا کہ ہمیں دیکھو۔ یہ ہم ہی تو ہیں۔ جو وصل کی آرزو میں اپنوں کے ہاتھوں ان تاریک راہوں میں مارے گئے۔

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

"صاحب!" وہ چلائی۔ "کیا ہوا صاحب؟" حسن امام کچھ نہ بول سکے۔ دونوں ہاتھوں سے ان کا سر اور چہرہ تھام کر وہ فریاد کناں تھی۔

"یہ کیا ہو گیا صاحب! کچھ تو بولیے' کچھ تو بتایئے؟"

اور زندگی میں بہت تیزی اور روانی کے ساتھ بولنے والے حسن امام نے اٹک اٹک کر کہا۔

"مجھے قسم ہے اس وطن کی۔ میں ان غداروں کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی اور اس کی اپنی چیخوں کی آواز اس کی اپنی سماعتوں سے ٹکراتی رہی۔ پھر آنکھوں نے دیکھا۔ لہو رنگ پیراہن کے اوپر زخمی وجود پر بند لب کچھ کہہ رہے تھے۔

"منزہ میرا وطن' میرا پرچم۔"

دکھ کی برسات چھما چھم برستی رہی۔

ہوائیں بین کرنے لگیں اور بنگال کی بھری بہار میں منزہ حسن امام کا سہاگ لٹ گیا۔

آج صبح سویرے اس گھر سے قرآن پاک کے مقدس سائے تلے رخصت ہونے والا وجود رات گئے شہادت کے اعلا و ارفع مرتبے پر فائز ہو کر واپس آیا۔

کیا کسی سہاگن کی زندگی میں برپا ہونے والا یہ سانحہ کچھ کم تھا کہ وہ سہاگ کا سرخ جوڑا پہن کر مشرقی پاکستان کی سرزمین پر اتری اور بیوگی کا کفن اوڑھ کر واپس آئی۔

بڑی قیامت ٹوٹی اور منزہ حسن امام کی زندگی میں اس رات کے بعد کبھی کوئی سحر طلوع نہ ہو سکی۔ قومی پرچم میں لپٹا ہوا وہ تابوت مغربی پاکستان کی سرزمین پر اترا۔

اور وفاؤں کی لاج رکھتے ہوئے۔ میجر تحسین تاج اور بھرما اس جسد خاکی کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کے آنسو بے پایاں شرمندگی کا تاثر لیے ہوئے تھے۔ وہ ایک ماں سے معذرت خواہ تھے کہ اس سمت سے وطن کی حفاظت کے لیے جانے والے اس کے بیٹے کی زندگی کے مقروض ہو گئے تھے۔

پھر وفا شناس لوگوں نے دیکھا۔ میجر تحسین تاج نے میجر حسن امام کے تابوت پر سر رکھ کر روتی ہوئی منزہ کے پاک آنچل کو تھام کر بدلہ لینے کی قسم کھائی۔

یہ سب کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ ان کی جیپ کے ڈرائیور کا زخموں سے چور وجود تو ڈھاکہ کے مضافات کی ایک مرکزی سڑک پر ملا۔ بہت کوشش کی گئی کہ وہ اس سانحے کی تفصیل بتا سکے۔ لیکن وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی زبان کاٹ دی گئی تھی۔ اس نے ہسپتال میں اپنی آخری سانس لیتے وقت ہاتھوں کے

اشارات سے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی کچھ نہ سمجھ سکا اور یہ سانحہ ایک معمہ بن گیا۔

حسن امام چلے گئے۔ ماں بہنوں اور بیوی کا جہان ویران و سنسان ہو گیا۔ آنکھیں روتی رہیں اور ایک اذیت ناک دور کا آغاز ہوا۔

دلوں کے دروازے بند۔ مذاکرات ناکام اور سب وسیلے بے جواز قرار دیے گئے۔ حسن امام کو مغربی حصے کی مٹی کے سپرد کرنے کے بعد جب سکین تاج اور مصطفیٰ کمال چھ دن کے بعد واپس ڈھاکہ پہنچے تو حیرت انگیز کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ بنگال کے افق پر چھائے ہوئے سیاست کے چند روشن اور چمک دار ستارے بریگیڈیئر سراج اور نادر محی الدین کی ضمانت کروا چکے تھے۔ یہ اسباب کس طرح بنے اور ان کے پیچھے کیا محرکات تھے؟ ان کو سلاخوں سے باہر لانے میں کیا مصلحت تھی؟ کسی کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ سیاست کے مہروں کی وہ چال تھی۔ جس کے تحت کامیابی ہمیشہ ان ہی مہروں کا نصیب بنتی ہے۔

میجر سکین تاج نے سب کچھ سنا اور دیکھا۔ اس کا لہو کھول رہا تھا۔ لیکن لب خاموش تھے۔

ساون کی رت کا ابتدائی سماں تھا۔ جب اس نے بریگیڈیئر سراج کو ایک بے ہنگم ہجوم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے سنا۔ نادر محی الدین اسے اپنے رنگ میں رنگنے کے بعد اطمینان سے بیٹھا اس کی زہر فشانی کو سن رہا تھا۔ سادہ لباس میں ملبوس وہ اسٹیج کے قریب موجود تھا۔

اس نے دیکھا۔ فوج کا روایتی ڈسپلن اور نظم و ضبط قطعی طور پر فراموش کرتے ہوئے بریگیڈیئر سراج ایک ایسے سیاست دان کے روپ میں ڈھل چکا تھا۔ جو زندگی بھر میں نہ ماننے کی پالیسی پر عمل درآمد کرتے ہوئے قوم کی زندگی سے کھیلنے کی پالیسی پر گامزن رہتا ہے۔ اسے اقتدار کی طلب ہوتی ہے۔ صرف اقتدار کی۔ چاہے اسے کسی بھی قیمت پر کیوں نہ حاصل کرنا پڑے۔

کل کا بریگیڈیئر سراج آج کا سیاست دان سراج الدین غنی بن چکا تھا۔ وہ آزادی چاہتا تھا۔ اس خطے کو ایک الگ نام ایک الگ پہچان دینا چاہتا تھا اور میجر سکین تاج جیسے باوفا اور محب وطن شخص کو یہ کسی بھی صورت گوارا نہ تھا۔

محفل جلسے کا رنگ اختیار کرتے ہوئے تمام ہوئی۔ بریگیڈیئر سراج اسٹیج سے نیچے اترے۔ اچانک ان کی نظر سکین تاج پر پڑی اور ایک گہری طنزیہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ مسکرائے اور زہریلے لہجے میں بولے۔

"ہیلو میجر سکین تاج! کیسے ہو بھئی اور سناؤ فوج کی کیا خبریں ہیں؟"

"فوج بالکل خیریت سے ہے سر!" سکین تاج نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب چاہتی ہے۔"

"بہت خوب۔" وہ مسکرائے۔ "ابھی جواب نہیں تمہاری ہمت کا بھی۔ ہر جگہ مار کھا رہے ہو اور پھر بھی گمان ہے کہ خیریت سے ہو۔"

"کون کس جگہ مار کھائے گا۔" میجر سکین تاج نے کہا۔ "اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا۔"

"یہ فیصلہ وقت پر مت ڈالو۔" بریگیڈیئر سراج نے کہا۔ "اب وقت ہمارا ہے۔"

"وقت بھی کسی کا نہیں ہوتا سر!" میجر سکین تاج نے کہا۔ "آپ شاید بھول چکے کہ آپ بھی کسی وقت اس زندگی کا ایک حصہ تھے۔ جسے اس وقت آپ برا بھلا کہہ رہے ہیں۔"

"واہ کیا بات ہے۔ یعنی کہ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔" [illegible] نہیں جائے گا [illegible] [illegible] طے کرتے ہوئے غداروں کے گلے میں پھانسی کا پھندا [illegible] ہے۔" بریگیڈیئر سراج تلملائے تو ضرور۔ لیکن میجر سکین تاج کی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ انہوں نے نادر محی الدین کی آڑی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

ہجوم منتشر ہو گیا اور اس منتشر ہجوم پر نظریں جمائے ہوئے نہایت اضطراب اور بے چینی کے عالم میں۔ میجر سکین تاج بار بار اپنی مٹھیاں کھولتا اور بند کرتا رہا۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ اب جلسہ گاہ میں ویرانی تھی۔ اس نے کچھ دیر تک بہت کچھ سوچا اور پھر مطمئن ہو کر گھر کی طرف چلا گیا۔

صبح کا روشن سویرا طلوع ہوا۔ سنہری سورج نے بنگال کے چپے چپے کو روشنی، زندگی اور حرارت بخش دی۔ دریاؤں کا پانی چمک اٹھا۔ ہریالی کھل گئی اور پھول ہونے اپنے جوبن پر آئے۔ تو آگ کا اک شرارہ ہر طرف پھیل گیا۔ اس صبح بریگیڈیئر سراج اپنے گھر میں بیڈ روم کے اندر مردہ پائے گئے تھے۔

ان کی موت نہایت پر اسرار واقع ہوئی تھی۔ رات ڈھائی بجے انہوں نے نادر محی الدین سے فون پر بات کرتے ہوئے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا۔ لیکن صبح ان کے نصیبوں میں نہیں تھی۔ اپنی زندگی کی اس آخری نیند سے وہ کبھی بیدار نہ ہو سکے۔ مجرم نے کہیں پر بھی کوئی ثبوت نہ چھوڑا تھا۔ ایک باریک رسی سے ان کا گلا گھونٹنے کے بعد وہ اطمینان سے فرار ہو چکا تھا۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا۔ اور کدھر چلا گیا؟ یہ پتہ نہ چل سکا اور وہ ذرا سی امن و سکون کی فضا جو بریگیڈیئر سراج اور نادر محی الدین کی رہائی کے بعد سامنے آئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر شور شرابے اور شورش کی نذر ہو گئی۔

ہر طرف شور مچ گیا۔ اخبارات چیخ اٹھے۔ بڑی بڑی سرخیاں جم گئیں۔ جیسے بنگال کے سینکڑوں کارکن سڑکوں پر آ گئے اور کشمکش تصادم کی فضا نے امن کو نگل لیا اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ علیحدگی کی اس تحریک کے سرکردہ راہنماؤں کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے فوج اپنا کردار ادا کرے۔

آخری چارہ کار کے طور پر اس اہم ادارے کو اپنا کردار نبھانے کے لیے واضح طور پر میدان عمل میں آنا پڑا اور فوری ایکشن [illegible] گیا۔

[illegible] کی فوری اور باقاعدہ میٹنگ کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلا موضوع بریگیڈیئر سراج کی پر اسرار موت کا تھا۔ نادر محی الدین چونکہ پہلے ہی مرحلے میں دوبارہ پس زنداں تھے۔ لہٰذا انہیں اس قتل کی ایف آئی آر درج کروانے کا موقع ہی نہ ملا۔ دوسرے درجے کے کارکن چند فوجی آفیسرز کا نام لے کر شور مچاتے رہے۔ لیکن ان کی شنوائی نہ ہوئی۔

اس میٹنگ کا عروج تھا۔ جب میجر سکین تاج باہر والے دروازے سے اندر داخل ہوئے اور خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ مصطفیٰ کمال نے بریگیڈیئر خلیل الرحمان شعلہ کی شعلہ بیانی سے ساعت ہٹا کر سکین تاج کی طرف دیکھا۔

اور پھر اچانک اس کا دل بے تحاشا دھڑک اٹھا۔ میجر سکین تاج کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو اپنا کوئی اہم مقصد پورا ہو جانے کی خبر دے رہی تھی۔

"تو کیا۔۔۔؟" دل نے سوال کیا۔

"میجر سکین تاج! تم میرے بنگالی بھائی! تم نے ہمارے لیے اپنے ایک ہم وطن کو فوج اور اپنی مٹی سے غداری کی سزا دی۔ کیا تم۔۔۔؟"

میجر مصطفیٰ کمال کی نظروں میں کئی سوال تھے۔ میجر فیروز خان نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اور حیرت کے آثار چہرے پر چھا گئے۔

"واہ میجر سکین تاج!" اس کا دل مسکرایا۔ "یار کمال کر دیا تو نے۔ مگر اک ذرا سی بے وقوفی کے ساتھ۔ تو نے جھرنا بھابھی، عکس اور امجد کے بارے میں نہیں سوچا۔" دل سے دل تک سوالات منتقل ہوئے اور خاموشی نے زبان بن کر جواب دیا۔

"میں اس دھرتی کا باسی ہوں۔ یہ مٹی میری ماں ہے۔ خدا کی قسم! میں اس کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔ رہا سوال میری نجی اور ذاتی زندگی کا۔ تو میں اس کے لیے صرف جھرنا۔ عکس اور امجد تو کیا اپنی ہر عزیز ترین شے قربان کر سکتا ہوں۔ مجھے قسم ہے اپنے رب عظیم کی۔ میں میجر سکین تاج۔ یہ عہد کرتا ہوں کہ میں اس دھرتی کے دفاع کی خاطر اپنی راہ میں آنے والے ہر غدار کو صفحۂ ہستی سے مٹا دوں گا۔"

مناسب احتیاط اور مختلف تدابیر اختیار کرنے کی ہدایات کے ساتھ میٹنگ ختم ہو گئی۔ میجر سکین تاج۔ مصطفیٰ کمال، فیروز خان اور کیپٹن شاہ پال باہر برآمدے میں آن رکے۔ میجر حسن امام کی جدائی نے انہیں دکھوں کے ایک عجب جہان سے آشنا کر دیا تھا۔ مصطفیٰ کمال نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور میجر فیروز خان سے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ ہم کمرہ بدل لیں۔ حسن امام کی یادوں کے ساتھ اس کمرے میں رہنا بہت مشکل ہے۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔" فیروز خان نے کچھ دیر کے لیے سوچا اور پھر ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔

اک کشکول سا جیون کو بنائے رکھنا
رات دن آنکھ سوئے طاق لگائے رکھنا
یوں ہی لوٹ آئیں گے اک روز وہ جانے والے
تم سر شام چراغوں کو جلائے رکھنا!

پھر سکین تاج کو اپنے ساتھ لنچ کی دعوت دیتے ہوئے مصطفیٰ کمال نے کہا۔

"آج تم کھانا ہمیں ہمارے ساتھ کھاؤ۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ مسکرایا۔ "کہ پھر اس کے بعد میں گھر جا کر مار کھاؤں۔"

شاید وہ بہت دنوں کے بعد مسکرائے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر بھی حسن امام کا ہی ذکر ہوتا رہا۔ "جسے بنگال والوں نے اس کی شہادت کی ذمہ داری قبول کرلی تھی اور اپنے اس کارکن کو انعام و اکرام سے نوازا تھا۔ جس نے اپنی پارٹی کے چند شرپسند عناصر کی موت کا بدلہ لینے کے بعد میجر حسن امام کے ڈرائیور کو زخمی حالت میں سڑک پر پھینک دیا تھا اور حسن امام کو زخمی حالت میں ان کی اپنی رجمنٹ تک پہنچانے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ سجاش دتہ نامی یہ کارکن آج کل کلکتہ میں مقیم تھا۔ اور اس اعتراف جرم کے بعد فوج کے خلاف مزید کارروائیاں کرنے کے اعلانات جاری کر رہا تھا۔

جب کیپٹن شاہ پال لنچ کے بعد اجازت لے کر چلا گیا۔ تو مصطفےٰ کمال کی سوالیہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے تمکین تاج نے کہا۔

"کھانا تو تمہارے ساتھ کھا لیا۔ لیکن اب میں اکیلا گھر نہیں جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ مجھے گھر چھوڑ کر آؤ۔"

"ایسا کرتا ہوں۔" مصطفےٰ کمال نے کہا۔ "میں تمہیں ایک سفارشی رقعہ دیتا ہوں۔ جھرنا بھابھی کو دے دینا۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن انداز میں بولا۔ "تو پھر میں چلتا ہوں!" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھ جاؤ برخوردار!" میجر فیروز خان نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور پھر دھیمی آواز میں سوال کیا۔ "کیا واقعی؟"

"ہاں بالکل صحیح ہے۔" سوال سمجھ کر جواب دیا گیا۔

"بھلا کس طرح۔" مصطفےٰ کمال نے پوچھا۔

"سوری۔ یہ نہیں بتا سکتا۔" تمکین تاج نے کہا۔

"بس اب اس بات اور اس سلسلے کو یہیں ختم کر دو۔" میجر فیروز خان نے گویا حکم جاری کیا۔

"نہیں، ہرگز نہیں۔" میجر تمکین تاج نے واضح لفظوں میں انکار کیا۔ "اگر یہ شورش ختم نہ ہوئی اور یہ لوگ وطن عزیز کو نقصان پہنچاتے رہے تو یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہی جائے گا۔"

"میجر تمکین تاج!" فیروز خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اپنا بہت خیال رکھنا میرے بھائی! ہمیں تمہاری زندگی بے حد عزیز ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے اعتراف کیا۔ "جب ہی تو بتا جائے آپ دونوں سب کچھ سمجھ گئے۔ لوگ مجھے اچھی

طرح جان چکے ہیں۔ ان شاء اللہ میں اس وردی ان وعدوں اور آپ بھی میرا مان کبھی نہیں توڑیں گے۔"

"ان شاء اللہ کبھی بھی نہیں۔" صدق دل سے کہا گیا۔

☼ ☼ ☼

جب دن کا سکون اور رات کی نیند نصیبوں میں نہ رہی۔ تو مصطفےٰ کمال نے کمرہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ لیا۔ اس سے قبل کہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنایا جاتا۔ رات کے آخری پہر حسن امام خواب میں شکوہ کناں تھے۔

"ہم نے تو فقط دنیا چھوڑی اور تم کمرہ چھوڑ رہے ہو۔ کیا اب ہماری یادیں اتنی ہی تلخ ہو گئیں؟" الفاظ لہو رنگ تھے اور لہجہ دکھ دکھ تھا۔ مصطفےٰ کمال یک دم بیدار ہو گیا۔ دوست نے اتنا زبردست شکوہ کیا تھا کہ رہا سہا سکون بھی بے چینی کی نذر ہو گیا۔ صبح اس نے ڈھاکہ سے لاہور کے لیے کال بک کروائی۔

دوپہر تک بات کرنی ممکن ہوئی۔ عارفہ لائن پر تھی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد اس نے بتایا۔

"بھابھی خاموش ہیں۔ بالکل خاموش۔ کچھ بولتی ہی نہیں۔ بہت دنوں کے بعد پرسوں شام بھیا کو بھیجا ان کے خواب میں آئے اور کہا۔ "میں حاجیوں کا جھاز لے کر جا رہا تھا۔ سوچا کچھ دیر کے لیے رک کر حال احوال دریافت کرتا چلوں۔ آپ سب ٹھیک تو ہیں ناں!"

"اور اماں کیسی ہیں؟" مصطفےٰ کمال نے پوچھا۔

"ان کا وزن بہت کم ہو گیا ہے۔ کچھ کھاتی پیتی نہیں۔ ہمارا اکلوتا بھائی چلا گیا ہے۔ اب یہ زندگی زندگی نہیں رہی۔"

مصطفےٰ کمال نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر رابطہ منقطع ہو گیا۔

اضطراب کی اسی کیفیت میں دوسرے دن کی ڈاک سے شاہ جی کا خط موصول ہوا۔ تقریباً پندرہ دن قبل تحریر کردہ خط کی عبارت تھی۔

"عزیزم نور چشم مصطفےٰ کمال!

ہم بہ حیثیت قوم اندھیرے کا اک سفر طے کرتے ہوئے اپنی تاریخ کے ایک اندھے موڑ تک آن پہنچے ہیں۔ ہم جو کہ ایک مسلمان قوم تھے۔ آج ٹوٹ کر بکھر رہے ہیں اور دنیا ہماری جدائی اور بربادی کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج اس نازک اور اہم موڑ پر بھی سیاست دان اقتدار کی اندھی ہوس میں اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہے ہیں اور

ماؤں کے لال ان کے مقاصد کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔

یہ ہوس اقتدار میں اس دھرتی کو بھول چکے ہیں۔ جس نے انہیں پناہ دی۔ اور ایک ماں کی طرح زندگی دی۔ ہم آزردہ ہیں اور فکر مند بھی۔ لیکن دعاگو ہیں۔

حالات پُر آشوب سہی۔ لیکن میری نصیحت ہے کہ ہمت نہ ہارنا۔ اپنے ساتھیوں سمیت جم کر حالات کا مقابلہ کرنا اور اپنے فرائض کی ادائیگی کچھ اس طور سے کرنا کہ اگر اس دوران تمہیں میری موت کی خبر بھی ملے۔ تب بھی نہ آنا۔

یہ وطن ہے۔ تو ہم ہیں۔ یہ وطن نہیں تو ہم بھی نہیں۔ یاد رکھنا۔ مسلمان زندگی میں غازی اور موت کے بعد شہید کہلاتا ہے۔ ان دونوں اعلا درجات کے بیچ اس کے لیے کوئی تیسرا راستہ نہیں ہوتا۔ اللہ پاک تمہیں تمام ساتھیوں سمیت اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین ثم آمین)

والسلام

دعاگو

سید برکت حسین شاہ

بنگال کی دھرتی پر ہونے والے آنسوؤں کے ساتھ اترتی تھی کبھی کبھی نہیں بلکہ اب تو اکثر ضبط کے بندھن ٹوٹ جایا کرتے تھے۔ ان آنسوؤں میں ملی قلم کی سیاہی نے جواب تحریر کیا۔

"بہت بڑے دکھ اور نہایت کرب ناک افسوس کے ساتھ تحریر خدمت ہے۔ ابا جی! ہمارے اور آپ کے خوابوں کا کل بنگال اب ایک محاذ میں بدل چکا ہے۔ ہم شاید منتشر ہو چکے ہیں۔ جبکہ ہمارا دشمن موثر ہے۔ ہم اپنے رب کریم کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ ان شاء اللہ ہم سرخرو لوٹیں گے اور بہت جلد۔

اور اگر ایسا مقدر میں نہ ہوا تو آپ سب صبر کا دامن تھام لیجیے گا۔

مجھے امید ہے آنے والا اچھا گن ہمارے لیے خوشیوں کا پیغام لائے گا اور اگر ایسا ممکن نہ ہو سکا تو میرا پیام ہے اس کے نام جس سے بڑی گہری نسبت تھی تم نے ٹھیک کہا تھا۔

"سپاہی کی محبوبہ کی چوڑیاں بھی.... شاید اس کے خوابوں کی طرح ہی ٹوٹ جاتی ہیں۔ لیکن تم زندگی بھر کے لیے ان چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے کھیلنے کی کوشش نہ کرنا۔ اپنا گھر ضرور بسا لینا۔"

محترمہ والدہ صاحبہ کی قبر پر بوقت حاضری دعائے خیر مانگتے وقت میری طرف دعاؤں کے نذرانے پہنچا دیں۔ تمام اہل خانہ سے سلام و آداب عرض کریں۔

آپ کا تابعدار مصطفےٰ کمال

☼ ☼ ☼

اتوار کی صبح تھی اور شدید ترین ٹینشن کے حالات' جب وہ اپنے والد گرامی کے نام اپنی اس تحریر کو آخری خط کی صورت میں پوسٹ کرنے نکلا۔

میجر فیروز خان کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ یہ خط پوسٹ کرنے کے بعد باری ہاؤس جائے گا۔ کرنل سلطان گیلانی نے فون کیا تھا کہ وہ شانی کی خیریت دریافت کرنے کے بعد انہیں بتائے کہ آیا وہ خیریت سے ہے یا اگر کوئی مسئلہ ہے تو وہ اسے بذات خود جا کر لے آئیں۔ وہ گیارہ بجے تک واپسی کا کہہ کر میس سے نکلا۔

اور پھر بنگال کی سنہری دھرتی نے اس کا وجود نگل لیا۔

رات گئے تک جب اس کی واپسی نہ ہوئی تو پریشانی نے بڑھ کر تشویش کا روپ دھار لیا۔ تلاش شروع کر دی گئی۔ ڈاک خانے میں موجود لیٹر بکس سے اس کا پوسٹ کردہ آخری خط لکھائی پہچان لینے کے بعد دوبارہ پوسٹ کے لیے ڈال دیا گیا۔

"باری ہاؤس" کے مکین صاف انکاری تھے کہ اس کے قدم تو گیٹ تک پہنچے ہی نہیں تھے۔ آرمی ڈاگ سنفر سے منگوائے گئے کھوجی کتے پوسٹ آفس اور "باری ہاؤس" کے درمیان درختوں کے ایک گھنے جھنڈ تلے جا کر رک گئے۔ مگر وہاں سے کوئی شواہد نہ ملے۔ صرف ایک جگہ گاڑی کے ٹائروں کے ہلکے سے نشانات موجود تھے۔

"باری ہاؤس" کی مکمل تلاشی لی گئی۔ مسز زینت باری کا غصہ عروج پر تھا۔ جبکہ شانی قسمیں کھا کر میجر فیروز خان کو یقین دلا رہی تھی کہ میجر مصطفےٰ کمال نے نہ تو کوئی رابطہ کیا تھا اور نہ ہی یہاں تک پہنچے تھے۔ قری ٹولہ چھاؤنی میں ایک ہلچل مچ گئی۔

ہیڈ کوارٹر میں تعینات اس اہم افسر کی گمشدگی ایک معمہ بن گئی۔

اس کی تلاش کا عمل جاری رہا۔ ایک عینی شاہد نے

صرف اتنا بتایا کہ اس نے ایک شخص کو ڈاک خانے کے باہر نصب لیٹر بکس میں ایک خط ڈال کر سڑک کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد دوسری سمت سے تین افراد آئے اور تیزی سے عقبی گلی میں چلے گئے۔ جس کے آخری سرے پر ایک چھوٹے سے بازار کا آغاز ہو جاتا تھا۔ اور اس بازار کے اختتام پر سول علاقے کے کچھ دفاتر تھے۔ بے حد طویل تفتیش کے بعد بھی وہ غریب مچھلی فروش اس واردات کی مکمل اطلاعات دینے سے قاصر تھا۔

ہاں' اتنا ضرور کہتا رہا کہ پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد اس نے ایک گاڑی تیزی کے ساتھ بازار کی سمت آتے ہوئے دیکھی تھی۔ جو بازار کے نشیبی علاقے پر واقع ایک چھوٹی سی پلی کو عبور کرنے کے بعد ان سول دفاتر کی اوٹ میں غائب ہو گئی تھی۔

اور پھر..... اس کے بعد ایک غریب مچھلی فروش کی آنکھیں کچھ نہ دیکھ سکیں کہ قری تولہ چھاؤنی اور اس سے ملحقہ اس سول علاقے کے درمیان "وہ آدمی" کہاں چلا گیا۔ میجر مصطفےٰ کمال جو کسی کی غریبی' کسی کا دکھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مس کلک کے بچوں کے اسکول کی فیس اور لانس نائیک فرید کے بوڑھے والدین کے علاج معالجے کے اخراجات ادا کرنے والا میجر مصطفےٰ کمال نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

قری تولہ چھاؤنی کے عقب میں بسنے والے کئی جھگی نشین گواہ تھے کہ ہر نوچندی جمعرات کو میجر مصطفےٰ کمال خیرات تقسیم کرنے آیا کرتے تھے۔ سخاوت کے اس بے مثال شعار کو اپنانے والا یہ باکمال سپوت میجر مصطفےٰ کمال۔ یہ سب کچھ اپنی اس تنخواہ میں سے مختص کردہ رقم سے کیا کرتا تھا۔ جو اس وقت کے لحاظ سے دو ہزار روپے تھی۔



میجر مصطفےٰ کمال کا تحریر کردہ آخری خط اپنی منزل پر پہنچ کر آنسوؤں کی برسات برسا گیا۔ بنگال کی سرزمین سے دور بہت دور گوجرانوالہ کے اس محلے میں واقع بیٹھک میں آہیں اور چوبارے پر بین آن بسے۔ ہاتھ اٹھے لب ہلے دعائیں عرش تک پہنچیں لیکن قبولیت کا در شاید بند تھا۔ شاہ جی کی آنکھیں دروازے کی سمت لگی رہیں۔ وقت مغرب آتا اور جاتا رہا۔ لیکن مصطفےٰ کمال بھی لوٹ کر نہ آیا!

میجر فیروز خان آہوں کے ساتھ اس کے لیے یہ شعر پڑھتے رہے۔

اب ہم کو ڈھونڈنے کا تکلف نہ کیجیے
ہم کھو گئے اگر آپ کا ملنا محال تھا۔

اپنے دوست کی تمام تر نشانیاں سنبھالنے کی کوشش میں جب اس کا سامان پیک کیا گیا۔ تو اٹیچی کیس کے ایک کونے سے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے دوپٹے کے آنچل میں لپٹے ہوئے ایک چھوٹی سی پوٹلی کی صورت میں ملے۔

یہ اس کی ذاتی زندگی کا وہ باب تھا۔ جو ایک ادھوری آرزو کی صورت دوستوں کے سامنے آیا۔ کمال احتیاط کے ساتھ یہ حسین یاد بھی مقید کر دی گئی۔



بنگال میں برسات شروع ہوئی تو اس دھرتی کی دلدل زمین میں تمام آرزوئیں اور آس و امید کی خوش رنگ کرنیں دفن ہو گئیں۔ قوم کے ہر فرد کی ذاتی زندگی بری طرح سے متاثر ہوئی۔

اور وقوع پذیر ہوتے ہوئے بے شمار سانحوں کے درمیان ایک اداس شام کو میجر تمکین تاج کے گھر اسجد کی سالگرہ کی [illegible] برسات کے ساتھ آئی۔ [illegible] بے حد اصرار پر تمکین شاہین اور میجر فیروز خان شرکت کے لیے آ گئے۔ لیکن دل و جان پر قیامت گزر گئی۔ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں وہ نشست خالی اور ویران تھی۔ جہاں ہمیشہ مصطفےٰ کمال بیٹھا کرتا تھا۔ کھڑکی کے پاس آ کر وہ سمیٹتے ہوئے وہ مسکرا کر کہتا۔

"کوئی زیادہ تکلف نہ کیجیے گا بھابھی فقط دس بارہ ڈشز کافی رہیں گی۔"

دوستوں کا ذکر خیر شروع ہوا۔ تو میجر تمکین تاج کی ان کوششوں کو بے حد سراہا گیا۔ جس کی وجہ سے میجر حسن امام کے سانحہ شہادت کا مرکزی کردار بھاشی دتہ گرفتار ہوا اور اس نے کئی اہم انکشافات کیے اور اس گرفتاری کی وجہ سے مزید کئی سانحات آتے آتے ٹل گئے۔ یہ اہم نقطہ بھی زیر بحث رہا کہ میجر مصطفےٰ کمال کی بازیابی یا پھر دوسری کسی صورت حال کے سامنے آنے تک اس کے گھر والوں کو مطلع نہ کرنا ہی بہتر رہے گا۔

"کیا فائدہ؟" بے حد آزردہ دلی کے ساتھ میجر فیروز خان نے کہا۔ "اچھا ہے۔ کچھ عرصہ مزید وہ سب اس آس اور

امید کے ساتھ جی لیں۔ کہ مصطفیٰ کمال واپس آجائے گا۔ ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا ہوا۔ گوجرانوالہ شہر کے اس محلے کی گلیاں اس کے قدموں کی چاپ سنیں گی۔"

نیچی بیٹھک اور اوپری چوبارہ ایک مرتبہ پھر سے آباد ہو جائے گا۔ ہر طرف امن و سکون اور خوشی ہو گی اور پھر پھاگن کے سنہری پیلے رنگوں میں مہندی کا رنگ کھل کر سارے خواب پورے کر دے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا؟

دکھی دلوں کے جھرمٹ میں اک ننھی سی خوشی اپنے دل میں بسائے ہوئے اسجد نے اپنی سالگرہ کا کیک کاٹا۔ اس وقت اس قوم کی ایک دکھی ماں مسز سکینہ تاج نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میں اکثر سوچتی ہوں۔ ہم نے تو ایک مکمل اور جامع تاریخ پڑھی۔ انسانی قربانیوں سے بھرپور اور فتح و کامرانی کے ہر باب سے مزین تاریخ پاکستان۔ ہمارے آج کے یہ بچے، یہ نئی نسل کتنی بدنصیب ہے کہ اس کے حصہ میں تاریخ کے یہ اوراق سامنے آئیں کہ طویل قربانیوں اور کوششوں سے حاصل شدہ یہ حصہ سیاست دانوں کے اغراض و مقاصد کی وجہ سے دولخت ہو گیا۔"

بڑی دکھی شام میجر سکینہ تاج کے گھر میں اتری۔ وقت رخصت کیپٹن شاہ پال نے ایک لفافہ ننھے اسجد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ..... بیٹے جی آپ کے گفٹ کے لیے۔"

"رہنے دیں بھائی!" جھرنا نے کہا۔ "اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟"

"رکھ لیجیے بھابھی!" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ "کیا خبر اسجد کی اگلی سالگرہ پر ہم ہوں نہ ہوں۔"

"اللہ نہ کرے بھائی!" جھرنا نے کہا۔ "اللہ پاک آپ کو صدیوں کی زندگی دے۔"

"ہم صدیوں کی زندگی کے تو طالب ہی نہیں ہیں۔" میجر فیروز خان نے کہا۔ "صرف اتنا چاہتے ہیں جب تک بھی جئیں سرخرو رہیں۔"

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔" میجر سکینہ تاج نے کہا۔ "کچھ پتا نہیں کل کیا ہو گا؟ کل کون ہو گا۔ کون نہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔" اس کا لہجہ مایوس کن تھا۔

"اس طرح مایوس نہیں ہوا کرتے۔" میجر سکینہ تاج نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ان شاء اللہ بہتری ہو گی۔"

"ہاں ان شاء اللہ ضرور بہتری ہو گی۔" میجر فیروز خان نے کہا۔

"ہمیں اپنے رب کی ذات پر بھروسہ ہے۔ وہ کیا خوب کہا ہے۔ کسی شاعر نے۔

قدم قدم پہ ہواؤں سے رابطہ رکھنا
خزاں کی رت میں بہاروں کا آسرا رکھنا
میری یاد کی خوشبو ضرور آئے گی
تم اپنے دل کا دریچہ ذرا کھلا رکھنا

انہوں نے حسب عادت یہ قطعہ پڑھا اور پھر جھرنا بھابھی اور بچوں سے اجازت چاہی۔

ڈھاکہ کے آسمان پر روشن چاند بہت جلدی اک ہلکی سی تاریکی کا سماں بکھیرتے ہوئے دوسری سمت کا سفر اختیار کر گیا۔ ہلکے بادل چھا گئے۔ اور برسات کا سماں سامنے چلا آیا۔ میس پہنچتے ہی ایک انتہائی اہم پیام ملا۔ ویٹر نے بتایا۔

"سر! باری ہاؤس سے ثنا بی بی کا فون آیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ جلدی "باری ہاؤس" پہنچیں۔"

"کیا بات ہو سکتی ہے؟" کیپٹن شاہ پال نے سوچا اور چاہا کہ اس معاملے میں میجر فیروز خان کو بھی اعتماد میں لیا جائے۔ لیکن وہ سوئے ہوئے تھے۔ [illegible] کا احساس کرتے ہوئے وہ "باری ہاؤس" کی طرف روانہ ہو گیا۔

قریۂ تولہ چھاؤنی کو سول علاقے سے الگ کرنے والی سڑک کی دوسری سمت پہنچتے ہی اسے ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ دو افراد مل کر ایک تیسرے شخص کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔ وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ اسے اپنی سمت آتے ہوئے دیکھ کر وہ دونوں افراد پلٹ کر بھاگ گئے۔ کیپٹن شاہ پال کی نظروں نے صاف پہچان لیا۔ وہ مستی اور ہوشی تھے۔

زمین پر گرے ہوئے شخص پر اس کی نظر پڑی۔ تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ قدرے زخمی حالت میں پروفیسر روشن خیال تھے۔ شاہ پال تیزی سے لپک کر ان کے پاس پہنچا۔ اور ان کے زخمی وجود کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"کیا ہوا سر! یہ سب؟" اور پروفیسر روشن خیال کی ٹوٹتی بکھرتی ہوئی آواز نے ایک قیامت برپا کر دی۔

"یہ لوگ مسز نزہت باری کی بہو ثنا کو اغوا کرنا چاہتے

ہیں۔ تاکہ اس کے بدلے میں بھاشانی اور نادر محی الدین کی رہائی کے علاوہ دیگر مطالبات منوا سکیں۔ میں نے اس عمل میں ان کی پلاننگ کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ اور اس خیال کی مخالفت کی۔ جس کی مجھے سزا ملی۔"

"او مائی گاڈ" کیپٹن شاہ پال نے اونچی آواز میں کہا۔

"یہ پلان کب بنا؟"

"آج شام کو۔" پروفیسر روشن خیال نے انکشاف کیا۔ "میں لاکھ برا انسان ہی سہی۔ لیکن اس گھناؤنے جرم میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

وہ فوراً" بے حد جلدی "باری ہاؤس" پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن انسانیت کا تقاضا تھا کہ پہلے پروفیسر روشن خیال کو ہسپتال پہنچایا جائے۔ جو اس وقت اندرونی ضربات اور بیرونی چوٹوں کی وجہ سے شدید درد کے باعث سخت تکلیف میں تھے۔ انہیں ہسپتال پہنچانے کے بعد جب وہ واپس جانے کے لیے کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ تو پروفیسر روشن خیال نے اسے پکارا۔

"ذرا ٹھہرو میری بات سنو۔" کیپٹن شاہ پال نے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اک التجا تھی۔

"مجھے معاف کر دینا۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "میں نے دشمن سے سازباز کرتے ہوئے کیا [illegible] جرم کیا۔ انسان دوستی کا راستہ ترک کر کے دشمنی کی شاہراہ پر چلتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو فراموش کر ڈالا۔ دعا کرنا کہ پاک پروردگار مجھے بخش دے۔"

آنسو آنکھوں کے حجروں سے باہر آ گئے۔ شاہ پال بنا کچھ کہے تیزی سے باہر نکل گیا۔

چاند کی موسم روشنی میں "باری ہاؤس" کی سفید عمارت اپنے اندر بڑی گہری خاموشی لیے ہوئے بالکل سامنے موجود تھی۔ آہنی گیٹ بند تھا۔ وہ پچھلی سمت سے عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ سرونٹ کوارٹر میں روشنی تھی۔ اس نے چند لمحے سوچا۔

اور پھر اپنی طبیعت پر جبر کرتے ہوئے پچھلی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ چاروں سمت اندھیرا تھا۔ پورچ کی لائٹ بھی بند تھی۔ وہ آگے بڑھنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ کہ اچانک سرونٹ کوارٹر کا دروازہ کھلا اور مہر بخش باہر آیا۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔ شاہ پال نے آہستہ سے آواز دی۔

"مہر بخش!" وہ چونک کر رک گیا۔ اور خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شاہ پال نے واقف حال ہونے کے باوجود اپنا تعارف کروایا۔ اور سوال کیا۔ "ثنا بی بی کہاں ہیں؟"

"صاحب! آپ میرے ساتھ آئیے۔" مہر بخش نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے کر سرونٹ کوارٹر کے اندر چلا آیا۔

"بڑا غضب ہوا صاحب!" وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ "میں دیکھ رہا تھا کہ کئی دنوں سے یہاں..... اس گھر کے اندر بڑی عجیب قسم کی سرگرمیاں جاری تھیں اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بڑی بیگم صاحبہ بھی ان باتوں میں برابر کی شریک تھیں۔ ثنا بی بی تو ایک طرح سے یہاں مقید تھیں۔ میں نے آج صبح ثنا بی بی کو اغوا کرنے کی واردات کا سارا منصوبہ اپنے کانوں سے سنا۔ آپ تک پہنچنے کی بہت کوشش کی صاحب۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔"

"اب ثنا بی بی کہاں ہیں؟" کیپٹن شاہ پال نے سوال کیا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ وہ میرے بھائی مولوی محمد ذکریا کے ساتھ کومیلا جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن روانہ ہوئی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"میں نے رات کے کھانے کے بعد بڑی بیگم صاحبہ کو چائے میں خواب آور گولیاں ملا کر دے دی تھیں تاکہ وہ سکون سے سو جائیں اور ثنا بی بی بحفاظت یہاں سے نکل جائیں۔ آپ نہیں جانتے صاحب! آج شام بڑی بیگم صاحبہ نے ثنا بی بی کو بلاوجہ بہت برا بھلا کہا اور ننھی رمشا کو ان سے چھین لینے کے بعد طلاق دلوانے کی دھمکی بھی دی۔ وہ اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتی تھیں۔ صاحب وہ بہت رو رہی تھیں۔ بہت پریشان تھیں۔"

مہر بخش اپنی ہی رو میں کہتا چلا گیا۔ اور کیپٹن شاہ پال مارے حیرت کے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ معصوم اور وفادار بنگالی مسلمان۔ جس نے ثنا کو مولوی محمد ذکریا کے ساتھ کومیلا جانے کے لیے روانہ کرنے کے بعد وہ اپنی دانست میں بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے خیر خواہی کرتے ہوئے کتنی بڑی غیر دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس وقت اتنی رات گئے ثنا کی ریلوے اسٹیشن روانگی بالکل اور قطعی طور پر غیر محفوظ تھی۔

کچھ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اور بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ شاہ پال نے مناسب سمجھا کہ ریلوے اسٹیشن جانے سے پہلے فون کر کے کرنل سلطان کیانی کو مطلع کر دیا جائے۔ وہ مہر بخش

کے ساتھ "باری ہاؤس" کے اندر آگیا۔ گیلری کے اندر آتے ہی اس کی نظر ایک فریم شدہ تصویر پر پڑی۔ جو فرش پر الٹی پڑی تھی۔ اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے جھک کر تصویر اٹھائی۔

آج پیارے قائد کی تصویر بنگال کی سرزمین پر گری پڑی تھی۔ یہاں یہ تصویر بھی بڑے عتاب کا نشانہ بنی رہی۔ اہل مفادات جب چاہتے۔ سجا لیتے اور جب چاہتے گرا دیتے وقت کا کیا عجب تماشا تھا۔

بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے اس نے فون اٹھایا۔ مگر وہ تو خاموش اور بے حس تھا اور وہ ڈھاکہ سے میلوں دور کومیلا کے فیاستی کنٹونمنٹ میں مقیم کرنل سلطان کیانی کو یہ اہم اطلاع فراہم کرنے سے قاصر تھا کہ آج ان کی لخت جگر اپنے ہی دیس میں اپنے ہی ہم وطنوں کے لیے اجنبی بن چکی تھی۔

وہ اندھیرے کی پروا کیے بغیر وہ تیزی سے قری تولہ ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کومیلا جانے کے لیے گرین ایرو (ٹرین) پلیٹ فارم پر آچکی تھی۔

رات کے اندھیرے میں اسٹیشن کے اندر بتیاں جل رہی تھیں۔ مگر دلوں پر بڑے گہرے اندھیرے چھائے تھے۔ اس نے بے تابی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ہر سمت اجنبی چہرے تھے۔ مسافروں کا ہجوم نہ تھا۔ وہ بے تابی سے آگے بڑھا کہ اچانک ویٹنگ روم سے کچھ فاصلے پر بنے ایک چائے خانہ کی اوٹ سے ثناء اپنی پانچ ماہ کی رمشا کو اپنے سینے سے لگائے مولوی محمد زکریا کے ہمراہ چلتی ہوئی سامنے چلی آئی۔ اپنے سامنے موجود لوگوں کو ہٹاتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھا اور عقب سے جا کر اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

"ثنا پلیز رک جائیے۔"

وہ رک گئی اور حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"امام صاحب!" کیپٹن شاہ بال نے مولوی محمد زکریا کو پکارا۔ وہ بھی ٹھہر گئے۔ اس نے قریب جا کر مدھم آواز میں کہا۔

"یہ سفر آپ کے لیے محفوظ نہیں۔ آپ آئیے میرے ساتھ۔ ہم آپ کو بحفاظت کومیلا پہنچانے کا ذمہ لیتے ہیں۔"

گرین ایرو (ٹرین) نے آخری سیٹی بجائی اور پھر اپنے وجود میں مسافروں کو سمیٹ کر چھک چھک کرتی ہوئی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ کیپٹن شاہ بال انہیں اپنے ہمراہ لیے ہوئے پلیٹ فارم سے باہر آنے کے لیے آگے بڑھا کہ اچانک دوسری سمت سے زبردست فائرنگ شروع ہوگئی۔

بنگال کی سرزمین پر برستی ہوئی گولیوں کی اس برسات نے کئی بے گناہوں کو لہولہان کرنے کے بعد ثنا اور رمشا کے ساتھ کیپٹن شاہ بال اور مولوی محمد زکریا کا وجود بھی چھلنی کردیا۔ ہر طرف لہو بکھر گیا۔ اس لہو کے چھینٹوں نے تیئس مارچ انیس سو چالیس میں لاہور کے مقام پر پیش کی جانے والی شیر بنگال مولوی فضل الحق کی اس قرارداد کا دامن داغدار کردیا۔ جس میں بنگال سمیت مسلمانان ہند کے لیے ایک الگ وطن پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

قری تولہ ریلوے اسٹیشن پر ثنا اور رمشا نے آخری ہچکی لی اور کرنل سلطان کیانی کی کل کائنات لٹ گئی۔

بنگالی مولوی محمد زکریا نے پاک وطن کی بیٹی کی عزت و عصمت بچانے کے لیے اپنے رب کے حضور اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیا اور وفا کی وہ تاریخ رقم کی۔ جس پر پاکستانی مسلمان ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے۔

سبز ہلالی پرچم کے سائے میں ایک اور تابوت مغربی پاکستان چلا آیا۔ اداس [illegible] قصبے کی۔ جب پاک فوج کے نمائندوں نے بابا محمد خان کے ڈیرے پر اس شہادت کی اطلاع پہنچائی۔ پوٹھوہار کی اس نواحی بستی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ ہر آنکھ نم تھی اور ہر لب خاموش تھا۔

اس گھر سے زینب اور گل کے بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جہاں اس کا بچپن گزرا۔ لڑکپن آیا اور جوانی بھی آکر چلی گئی۔ وہاں جسد خاکی اترا۔ اس صبح اپنے بڑھاپے کی ٹوٹی پھوٹی نیند سے بیدار ہونے والی بے جی اپنے حواسوں میں نہ رہیں۔ تابوت کے اوپر جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش میں اس کی آواز سماعتوں میں اتر آئی۔

"میں بہت تھک چکا ہوں بے جی، سونا چاہتا ہوں۔"

اور وہ سب کی آہوں سے بے نیاز بڑی گہری نیند سو گیا مگر اس کے بعد ڈاکٹر بیا "سنبل" کی آنکھیں زندگی بھر نہ سو سکیں۔ جو اس جسد خاکی کے ساتھ مغربی پاکستان آئی اور پھر ہمیشہ کے لیے یہیں پر بس جانے کا فیصلہ کرلیا کہ وفائیں کرنے والے تو محبوب کی قبر کی مٹی سے بھی عشق کرتے ہیں۔

اپنے آپ کو تیاگ کر ڈاکٹر بیا نے مستی اور جوش کے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ جو انہوں نے بھی رمشا سمیت چار بے گناہوں کو قتل کرنے کی صورت میں کیا اور اس کوشش میں اپنی عمر کی تمام فصل تن تنہا کاٹنے کے بعد پیری کی دہلیز پر آن رکی۔



وقت آگے بڑھا۔ موسم بدلا اور خزاں کی رت بنگال کے درختوں پر چھا گئی۔ سرسبز سرزمین نے ویلی مٹی کا روپ دھار لیا۔ خزاں رسیدہ پتے ہر سمت بکھر گئے اور انسانی پاؤں کے نیچے آکر چرچراتے ہوئے یہ سوکھے پتے وفاؤں کی صدائیں بکھیرتے ہوئے آنے والی طویل جدائیوں کا نوحہ سنانے لگے۔

آہوں اور سسکیوں کی بڑی دکھ بھری داستان تو اس وقت بھی رقم ہوئی۔ جب کرنل سلطان کیانی نے اپنی لخت جگر ثنا اور نواسی رمشا کے فقط گیارہ دن بعد اپنی شریک حیات نور سلطان کی ناگہانی موت کا صدمہ برداشت کیا۔

جو اس دردناک سانحے کی تاب نہ لاتے ہوئے دل کے دورے سے اس زندگی کے آزار سے نجات پا گئیں۔ کرنل سلطان کیانی کی دنیا اندھیر ہو کر رہ گئی۔ مگر لب خاموش [illegible] اپنی زندگی کے [illegible] صلیب [illegible] اٹھائے ہوئے وقت کی برپا کی جانے والی ہزیمت کے تحت جنگی قیدی بن گئے۔

میجر فیروز خان نے ہتھیار ڈالنے سے صاف انکار کردیا اور راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے اس دھرتی کی خاطر مدبریغ اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے شدید زخمی ہو کر جنگی قیدی بنے۔ ٹرین کا اذیت ناک سفر ختم ہوا۔ تو وہ ان حکمرانوں کی سرزمین پر پہنچ چکے تھے۔ جو تاریخ کے اس ظالم موڑ پر فتح کراچی فتح کا اعلان کرتے ہوئے برملا یہ اعتراف کر رہے تھے۔ کہ آج انہوں نے اپنی اس نام نہاد فتح کے نتیجے میں دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق کردیا۔

ہتھیار ڈالنے کا معاملہ سیاست کا کھیل ثابت ہوا۔ خیر خواہوں کی پیش کردہ مصالحت نامے کی قراردادوں کو سلامتی کونسل میں اقوام عالم کے نمائندوں کے سامنے پرزے پرزے کردیا گیا۔

اور وہ سب...... جو وفا کی ان تاریک راہوں پر مارے گئے اور وطن سے غداری کرنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ آنے والے وقت میں تاریخ انہیں کس حوالے سے دیکھے گی۔ وفا کے کس پیمانے سے جانچے گی۔ اور وہ انصاف کی کس کسوٹی پر پرکھے جائیں گے۔



تھے بہت بے درد لمحے ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

انا اور ضد کی اس جنگ کا وہ ایک لمحہ نہایت کربناک تھا۔ جو سولہ دسمبر بن کر آیا اور وقت مغرب سے پہلے تاریخ کا اک سیاہ ورق بن کر رخصت ہو گیا۔ جنہوں نے تحریک پاکستان میں اپنے لہو کا نذرانہ پیش کرنے والوں کے بطن سے جنم لیا تھا۔ انہوں نے اپنی آزادی کے لیے بزرگوں کی قبروں پر تہہ در تہہ جم جانے والی مٹی کو رسوا کردیا اور جب یہ مشرقی بازو ٹوٹا۔ تو گویا ایک عہد کی موت واقع ہو گئی۔

اور اس رات جب کہ سولہ دسمبر کا عذاب ٹوٹا۔ بڑے زور کی آندھی آئی۔ مغربی پاکستان کا آسمان آنسوؤں کے ساتھ رویا اور مرشد کی جھگی نیست و نابود ہو گئی۔ [illegible] سویرے جاگنے والی آنکھوں نے دیکھا۔ وہاں پر زمین [illegible] تنکوں۔ ادھر ادھر بکھری ہوئی راکھ اور مٹی کے ٹوٹے ہوئے مٹکے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اپنے خوابوں کے ٹوٹنے اور اس سرزمین کے الگ ہونے کا سانحہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے مرشد خدا جانے کس جہان کی طرف نکل گئے۔

سرزمین بنگال کی حفاظت کے لیے جانے والا میجر مسعود کمال پھر لوٹ کر نہ آیا۔ مہینوں تک کوئی خبر نہ ملی اور جب حکومت کی طرف سے

Missing beleived killed

کا تار موصول ہوا تو واپسی کی آس بھی دم توڑ گئی۔ تو سید برکت حسین شاہ نے آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو بھلا واپس کیسے آسکتا تھا میرے بچے! تو تو [illegible] بہادر اور جری ساتھیوں سمیت ساری کشتیاں جلا کر [illegible] تھا۔ میں تیری اور تیرے ساتھیوں کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

پھر وہ کبھی بھی کچھ نہ بولے۔ خاموش ہو گئے۔ ادھر آوازیں ٹوٹتی بکھرتی رہیں۔ اور ادھر حکمرانوں نے اپنے لیے نیا پاکستان تخلیق کرلیا۔

وہ ادھر الگ جینے لگے۔ اور ہم نے ادھر الگ اپنی دنیا بسا لی۔ غیروں کی شہ پر وہ ہمارے لیے اور ہم ان کے

اجنبی بن گئے۔ لیکن اس سودے کے عوض اپنی زندگیوں کی قربانی دیتے ہوئے ہم۔۔۔ اس عہد کے باوفا لوگ۔ ایسے حمال نصیب ٹھہرے کہ عمر بھر کا روگ جن کا مقدر بن گیا۔

پوٹھوہار کی اس نواحی بستی میں مقیم قبر کی مٹی سے اپنا رشتہ جوڑنے والی ڈاکٹر سنبل عرف ثریا کے خواب میں آکر کیپٹن شاہ پال نے فریاد کی۔

"خدا کے واسطے۔ رویا نہ کریں۔ میں آپ سب کے پاس آنا چاہتا ہوں لیکن بڑے گہرے سمندر میرے راستے میں حائل ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ ڈاکٹر ثریا آپ نے کبھی اپنا گھر بسانے کے بارے میں سوچا؟" یہ سوال نہایت بے معنی تھا۔ شہید کی قبر کی مٹی سے ناتا جوڑنے والی ڈاکٹر ثریاء اب اس دیس کی باسی تھی۔ جہاں اس نے "شاہ پال میموریل ہسپتال" کے نام سے ایک یادگار کا آغاز کیا تھا۔

ایسی یادگار جہاں غریبوں کے لیے بالکل مفت علاج معالجے کا انتظام تھا۔ وہ پڑھائی میں ننھی کلی کی معاونت کر رہی تھی۔ اس کا خواب تھا کہ وہ ڈاکٹر بنے اور اس کے بعد اس مشن کو جاری رکھ سکے۔ اس نے زینب کو اپنی بہن جان کر اس کے دکھوں کا مداوا کرنے کی کوشش کی تھی اور بوڑھی بے جی کے علاوہ اس گاؤں کے دیگر بزرگوں کی دیکھ بھال کا ذمہ بھی اپنے دل و جان پر لے لیا تھا۔ اس کی نسبت تو ایک شہید سے جڑی تھی۔

جن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ

"بے شک وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔"

ڈاکٹر ثریا کی اس قربانی سے متاثر ہو کر ایک صحافی نے سوال پوچھا۔

"ڈاکٹر ثریا! آپ نے کبھی اپنا گھر بسانے کے بارے میں نہیں سوچا؟"

اپنے فلاحی کاموں کے بدلے میں شہرت پانے والی بنگالی نژاد ڈاکٹر ثریاء نے اس سوال کا سامنا بڑے حوصلے سے کیا۔ اور پھر جواب میں کہا۔

"باوفا لوگ اپنے دل کی بستیاں بار بار نہیں بسایا کرتے۔ یہ بستی تو فقط ایک بار بستی ہے۔ اجڑ جائے تو ما سوائے ریت اور ملبے کے باقی کچھ نہیں بچتا اور ریت و ملبے سے کبھی بھی محل تعمیر نہیں کیے جا سکتے۔"

کتنی رتیں گزر گئیں اور سیاہ بالوں میں چاندی کے سفید تار جگمگا کر یہ ثابت کرنے لگے کہ وفائیں امر ہوتی ہیں۔



اس دوران حالات سنور گئے۔ مشرقی پاکستان کو نئے نام سمیت مان کر اس کی الگ حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا اور اس کی کابینہ کا ایک مرکزی وزیر جمال کا ممتاز قاضی اور ماضی کا مستی سرکاری دورے پر پاکستان آیا۔ اس نے چاہا کہ وہ ڈاکٹر ثریا سے ملاقات کرے۔ لیکن ڈاکٹر ثریا نے صاف انکار کر دیا اور کہا۔

"وہ اپنی زندگی میں اس نام کے کسی بھی شخص کو نہیں جانتی اور ملاقات کا تو سوال ہی نہیں کہ یہ ایک شہید کی قبر اور روح کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔ وہ نامراد سہی۔ لیکن باوفا ہے۔"

اپنے محبوب کی قبر کی مٹی سے زندگی بھر کے لیے رشتہ جوڑنے والی ڈاکٹر ثریا آج تک یہیں مقیم ہے اور علاقہ پوٹھوہار کو اس پر فخر ہے کہ بنگال کی اس بیٹی نے واقعی وفا کی ایک تاریخ رقم کر دی۔

شہر گوجرانوالہ میں بسنے والی خاموش اور باحیا زرقا نے میجر مصطفے کمال کی واپسی کی آس میں کئی برسوں تک ہر شام آس و امید کے چراغ جلائے۔ وجود پر لپٹا ہوا دھاگے کی طرح وہ شخص بار بار ہو گیا۔ اس کے لیے بچھے سامنے مقدر کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وقت مغرب آتا اور جاتا رہا۔ مگر مصطفے کمال پھر بھی لوٹ کر نہ آیا۔

کئی برسوں کے بعد شاہ جی کی خاموشی اس وقت ٹوٹی۔ جب پاک وطن کے ایک غدار مطیع الرحمان کی باقیات بنگلہ دیش کو واپس کی گئیں۔ حکمرانوں نے اپنے سرکاری دورے کے دوران اس سرزمین پر "آزادی" کے شہدا کی یادگار پر پھول چڑھائے۔ حکومتوں کے درمیان خیر سگالی کا سلسلہ قائم ہوا اور اس سلسلے کے ضمن میں آنے والے وفود کو خوش آمدید کیا گیا۔ تب شاہ جی کی خاموشی ٹوٹی اور انہوں نے آنسوؤں کی زبان میں کہا۔

"آج۔۔۔ کیسے سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ کیا انسانی زندگی میں غیرت و حمیت کی کوئی بھی حیثیت باقی نہیں رہی۔

آج اگر ایک غدار مطیع الرحمان کی باقیات واپس کر دی گئی ہیں تو پھر ہمارا بھی یہ حق بنتا ہے کہ سرزمین بنگال کے چپے چپے پر بکھری ہوئی ہمارے شہدا کی باقیات بھی واپس کر دی جائیں۔ مجھے بتایا جائے کہ میرا لخت جگر کہاں ہے۔ مجھے تو اس کی باقیات بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ کوئی خبر؟

کوئی قبر؟ کوئی نشانی؟ کچھ بھی تو نہ ملا اور ان حکمرانوں کی بے حسیاں دیکھو کس طرح شہدا کے لہو سے اپنی چراغ جلا کر شہادت جیسے عظیم مرتبے کی توہین کر رہے ہیں۔ اس عہد کے یہ نام نہاد کردار ساز آخر یہ کیوں نہیں سوچتے کہ غداری اور حب الوطنی میں زمین و آسمان جتنا فرق ہوتا ہے۔

مطیع الرحمان کی باقیات بنگلہ دیش کے حوالے کرتے ہوئے آخر یہ کیوں نہ سوچا گیا کہ جب یہ باقیات ایک محب الوطن پائلٹ راشد منہاس شہید کے ساتھ زمین پر بکھریں۔ تو اس لمحے ساری قوم دکھ اور کرب کی کس اذیت سے گزری تھی؟ کتنے دل اجڑے تھے؟ کتنی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ آس کے کون کون سے دیپ بجھ گئے تھے؟"



احساسات اور جذبات کی گندھی ہوئی اس زندگی کے بیچوں بیچ جیتے ہوئے۔۔۔۔ ایک صبح منزہ حسن امام کی آنکھیں بے شمار آنسوؤں سے بھر گئیں۔ پیارے پاکستان کے ایک مشہور و معروف روزنامے میں ایک دانش ور خاتون کا ایک بیان شائع ہوا۔ جس میں کم علمی اور بے عقلی پر مبنی یہ دعویٰ شامل کیا گیا کہ

"مشرقی پاکستان میں پاکستانی افواج نے غرب کو ایک قتل عام کی حکمت عملی کے طور پر اپنایا۔"

مزید کئی دانش وروں نے اس خیال کی تائید کی اور اس پر باقاعدہ بحث کی گئی۔

ابھی اس بحث کو سمیٹا بھی نہ گیا تھا کہ پاکستان سے بنگلہ دیش جانے والے ایک صحافی نے (جو ان کے الیکشن کی کوریج کے لیے تشریف لے گئے تھے) ایک سابقہ بنگالی فوجی افسر سے ملاقات کے بعد اپنے کالم میں تحریر کیا کہ سابقہ مغربی پاکستان میں دوران قید اس فوجی افسر نے کئی صعوبتوں کا سامنا کیا۔ یہاں تک کہ ذاتی اخراجات برداشت کرنے کے لیے ان کی بیگم صاحبہ کو اپنے زیورات فروخت کرنے پڑے۔ آخر میں جب انہوں نے اپنے کنگن فروخت کرنے چاہے۔ تو اس بنگالی فوجی افسر نے منع کر دیا۔"

یہ دونوں بیان اور کالم مل کر ان ستم رسیدہ دلوں پر بڑا ظلم ڈھا گئے۔ جن کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی زندگی جینے والی منزہ حسن امام آج یہ بیانات اور کالم

پڑھ کر مٹی کا ڈھیر بن گئی۔

اس نے بڑے طویل عرصے کے بعد صدیقی صاحب کے اس دعوت نامے کا جواب دیا۔ جو ان کی جانب سے سانحہ مشرقی پاکستان کے بارے میں منعقدہ ایک سیمینار کے بارے میں دیا گیا تھا۔ اور درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس میں بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائیں۔

چنانچہ یہ دعوت قبول کر لی گئی۔

سن دو ہزار اپنے دامن میں نئی تحقیق نئی نسل لیے ہوئے طلوع ہو چکا تھا۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے کئی عینی شاہدین کی آنکھوں کی جوت اب بجھنے والی تھی۔ کچھ چراغ سحری تھے اور کچھ اپنی عمر کے وقت عصر کے قریب زندگی کی شام کے انتظار میں تھے۔ منزہ حسن امام جیسی ہزاروں حماں نصیب خواتین کے چہروں پر ماضی کی داستان جھریوں کا جال بنتے ہوئے وقت کے اندھیروں میں گم ہو چکی تھی۔

اس سیمینار میں شرکت کے لیے آنے والی ڈاکٹر ثریاء (سنبل) کی ریشمی دراز زلفوں نے چاندی کے تاروں کا روپ دھار لیا تھا۔ کیپٹن شاہ پال کی لاڈلی بھانجی اور اپنے پیارے پیارے ماموں کی ننھی کلی اب میڈیکل کالج میں پروفیسر تھی اور اس سیمینار میں اپنے شہید ماموں کے سبب سے شرکت پر فخر محسوس کر رہی تھی۔

ایک مشہور اور معتبر حوالے سے شرکت کرنے والی منزہ حسن امام نے دیکھا۔ مرکزی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ آج بھی یہ دنیا بے حس نہ تھی۔ نئی نسل کے فرض شناس اور محب وطن افراد انہیں دیکھنا انہیں سننا چاہتے تھے۔

اپنی عمر کی ساری فصل کاٹ کر بیری کی شاہراہ پر گامزن صدیقی صاحب نے مختصر تعارف کے بعد منزہ حسن امام کو خطاب کی دعوت دی اور وہ جو۔۔۔ اپنے وقت میں تاریخ کی طالب علم تھی اور ایک بہترین مقررہ بھی نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ قارئین سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔

"ہم کبھی بھی تاریخ کو جھٹلا نہیں سکتے۔ تاریخ ایک بے رحم مضمون ہے۔ اس کے ہر باب میں آج رقم ہوتا ہے۔ برسوں بیت گئے۔ ہم نے اس مضمون کی ہر ستم ظریفی کو سہہ لیا۔

آج کے یہ دانشور اور خصوصاً" خواتین دانش ور اگر کسی گہری نیند سے بیدار ہو کر یہ۔ وٹی کرتی ہیں کہ سابقہ

مشرقی پا... میں فوج نے "ریپ" کو ایک جنگی حکمت عملی کے طور پر اپنایا۔

تو وہ اس اذیت، ظلم اور عذاب کا ذکر کیوں نہیں کرتیں۔ جو اس دوران وہاں "مکتی باہنی" کی صورت میں مسلط کیا گیا؟ اور جس نے دشمنوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگے؟ ان پر کوئی فرد جرم کیوں عائد نہیں کی گئی۔ وہ کیوں ہر غلطی ہر قصور سے مبرا قرار دیے گئے۔

آج اپنی نام نہاد دانش وری کے پھول بکھیرتے ہوئے اس قوم کے سپوت نے نہیں۔ بلکہ بیٹی نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہاں اس محاذ پر شجاعت اور بہادری کی داستانیں رقم کرنے کے بجائے "ریپ" جیسے قبیح فعل کو جنگی حکمت عملی کے طور پر اپنایا گیا۔ ایسا قبیح الزام تو دشمن بھی نہیں لگاتے۔ یہ خواتین شاید یہ نہیں جانتیں کہ عزت و عفت و عصمت فقط مومنات ہی کی میراث نہیں ہوتی۔ ہر مومن مسلمان بھی باعزت اور باعفت ہوتا ہے۔ غازی اور شہدا کا جذبہ، سوچ اور عمل اسلام کے عین مطابق ہوتا ہے۔

میری درخواست ہے کہ خدارا! اگر آپ لوگ ہمارے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتے۔ تو ان پر نمک تو نہ چھڑکیے۔

اس سابقہ بنگالی فوجی افسر کی بیگم صاحبہ تو بہت خوش نصیب تھیں کہ وہ اپنی کلائیوں میں سہاگ کی نشانی کنگن پہنے ہوئے اپنے سر پر سہاگ کا تاج سجا کر مغربی پاکستان سے واپس اپنے نئے وطن لوٹ گئیں۔ یہاں ان کے سہاگ سلامت رہے۔ اولادیں زندہ رہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ ہمارے ہاں تو سابقہ مشرقی پاکستان سے لٹی پٹی جو خواتین ایک طویل دکھی ہجرت کے بعد جب واپس مغربی پاکستان پہنچیں تو ان کی تو کلائیاں ہی نہیں تھیں۔ ان کے سہاگ سرزمین بنگال پر لٹ چکے تھے۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں تھیں۔ لیکن انہوں نے آج تک کبھی کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔

برسہا برس گزر گئے۔

صدی نے اپنا چلن بدلا اور تاریخ کے اس دردناک سانحے کے تمام مجرم بری ہو گئے۔ فقط فوج ہی کی بے گناہی ثابت نہ ہو سکی۔ وہ بہ حیثیت ایک ادارے کے آج بھی زیر عتاب ہے کہ محض ایک غاصب فرد کی ذاتی حیثیت یا ہوس اقتدار کے سبب ہمیشہ اس ادارے کو مورد عتاب جانا گیا۔ جس میں شامل افراد ان سے باوفا تھے۔ آج بھی باوفا ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گے۔ اور پھر وفاؤں کی یہ تاریخ کچھ اس طرح رقم ہوئی۔ کہ ڈھاکہ کے ایک ہسپتال میں بستر مرگ پر لیٹے ہوئے پروفیسر روشن خیال نے اس دنیا سے بوقت رخصت "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔

آگرہ کے جنگی کیمپ میں زخمی اور معذور میجر فیروز خان پکارتا رہا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

میجر حسن امام کی ماں جائی بہنیں آج بھی "اے پتر ہٹاں تے نہیں وکدے" کی صورت میں صوفی غلام مصطفی تبسم کا کلام سن کر آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی ماں روتے روتے بینائی کھو بیٹھی۔

گوجرانوالہ شہر کے اس محلے میں بسنے والے شاہ جی کی بیٹھک کا دروازہ برسوں کھلا رہا۔ آس اور امید کے خواب دیکھتے دیکھتے شاہ جی کی آنکھیں سو گئیں۔ نچلی بیٹھک ویران اور اوپری چوبارہ خاموش ہو گیا۔

زرقا کے دل کی دنیا لٹ گئی۔ پہلے پہل تو آنسو برسے ہے۔ پھر ایک طویل چپ نے ... کا گھیراؤ کر لیا۔ آج بھی علاقہ چوبارہ کی اپنی نواحی بستی میں مقیم ... بہن زینب اپنے اکلوتے بھائی کی یاد میں بین کرتے ہوئے روتی ہے۔ اور اس کے دل کی ہوک مشہور صوفی شاعر میاں محمد بخش کے اس مصرعے کی صورت میں زبان پر آتی ہے کہ "لا پریت محمد بخشا جگ وچ رہی کہانی۔" "ڈاکٹر ثریا" نے اس شہید کی قبر پر حاضری اپنا معمول بنا لیا۔ جو وفاؤں کی راہ کا مسافر تھا۔ جس نے اسے چاہا اس سے نسبت جوڑی۔ لیکن اسے اپنا نہ سکا کہ تقدیر کو یہ منظور ہی نہ تھا۔

اور سنبل ڈاکٹر ثریا وہ اپنا وطن چھوڑ کر اس مٹی میں آن بسی۔ جہاں اس کے محبوب کا مسکن تھا اور دنیا کو اپنی عمر بتا کر دکھا دیا کہ دیکھو وفا اسے کہتے ہیں۔

ضلع جہلم کی ایک نواحی بستی میں مقیم کرنل (ریٹائرڈ) سلطان کیانی جنگی قیدی کے طور پر دشمن کے ہاتھوں لگائی گئی آہنی ضربات کے نتیجے میں اپنی یادداشت کھو جانے کے باوجود آج بھی احباب سے یہ سوال ضرور پوچھتا ہے۔

"میرا پاکستان کہاں ہے؟"

اور وردی۔ وعدہ اور وفاؤں کی اس کہانی کا ایک مجسم کردار متحدہ پاکستان کا حامی محب الوطن وہ میجر تحسین تاج۔ جس نے علیحدگی کا دکھ سہنے کے بعد یہ کہتے ہوئے بنگلہ دیش کی فوج میں شمولیت اختیار کرنے سے معذرت کر لی کہ وہ صرف "پاکستانی فوج کا سپاہی ہے۔"

ڈھاکہ میڈیکل کالج کی پرنسپل مسز زینت باری کو پچھتاوے چین نہیں لینے دیتے۔ ان کے اپنوں نے اس نام نہاد آزادی کے چند برس بعد نادر محی الدین کو قتل کر کے ثابت کر دیا کہ بے وفا اور بے مہر انسانوں سے وقت انتقام لیتا ہے۔

اپنی عمر کی فصیل کے درمیانی سرے پر موجود کومل اپنے بچوں کے علاوہ نئی نسل کو بھی ستارہ پاک سرزمین کی دھن سناتی ہے۔

اپنے چاندی جیسے بالوں میں گزرتے وقت کے اک اک لمحے کو تلاشتی ہوئی منزہ حسن امام آج بھی محو انتظار ہے۔ خدا جانے کیوں؟

سرزمین بنگال کی باسی ہیری کی دہلیز پر مقیم مسز جہرنا مسکین آج اپنے بچوں کو حب الوطنی کا درس دینے کے بعد آج ان کے بچوں کو کہانی سناتے وقت کہتی ہے۔

"پیارے بچو! یہ جو ہمارا دیس ہے نا۔ یہ بھی۔۔۔ ایک تھا پاکستان۔" پھر اس کی آواز بھرا جاتی ہے۔ آواز زبان کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اور یادوں کے دریچے کھل جاتے ہیں۔

محب وطن بنگالی شاعرہ شاہ زمانی بیگم نے بھی اس تقسیم کو دل سے قبول نہ کیا۔ انہوں نے زندگی میں اکلوتے بیٹے ممتاز قاضی عرف مستی کی جیتے جی جدائی تو برداشت کر لی۔ لیکن علیحدگی کے اس سانحے کو برداشت نہ کر سکیں اور پاکستان ٹوٹنے کے غم میں روتے روتے ان کی بصارت سے محرومی ان کی زندگی کا اک اذیت ناک سانحہ بن گئی۔ وہ اس وقت لکھ نہیں سکتیں۔ لیکن متحدہ پاکستان کے لیے نظمیں کہتی ہیں اور کومل ان کے احساسات اور جذبات کو ضبط تحریر میں لاتی ہے۔

قمر الدین قاضی صاحب جیسے وفا شناس انسان نے وطن کے لیے اپنے اکلوتے وارث کو اپنی زندگی سے الگ کر دیا۔ جب تک زندہ رہے۔ اس کی شکل نہ دیکھی۔ اور مرتے وقت وصیت کر گئے کہ مستی جیسے غداروں کو ان کا جنازہ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ قمر الدین قاضی صاحب کی رحلت کے بعد کومل نے ایک ادیبہ کی حیثیت سے متحدہ پاکستان کی وہ تاریخ رقم کی۔ جس میں اعلا کردار ساز افراد کی پاکستان سے محبت اور وفا کا عملی نمونہ پیش کیا گیا تھا۔

برسوں گزر گئے۔ لاکھوں سورج ابھرے اور ڈوبے کئی صبحیں طلوع ہوئیں کئی شامیں آئیں۔ رتیں بدلیں اور موسم آتے جاتے رہے۔ لیکن وہ سب جو ماضی کی سرزمین بنگال پر اپنے لہو کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد سرخرو ہو گئے تھے۔ لوٹ کر نہ آئے۔ پرانی شناسائی کی کھڑکیاں تو کھلیں۔ مگر کبھی کسی دریچے سے ملن کی صدا نہ آئی۔ اور باقی رہ جانے والے صرف جیتے ہی رہ گئے یادوں کے ساتھ۔ امیدوں کے ساتھ اور ہجر کی طویل مسافت کے ساتھ۔

اور..... آج بھی ہر شام اپنے آنسوؤں سے دیا جلانے والی ایک پگلی اپنے سر پر ڈھاکہ کی ململ کا تار تار دوپٹہ لیے ایک بوسیدہ تولیہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے آنے جانے والے زائرین کا دامن پکڑ کر پوچھتی ہے۔

"میرے پیا کا کوئی سندیسہ آیا ہے۔"